ملکہ پونچی (پونجی) خاتون

بیجاپور کے پہلے عادل شاہی فرمانروا یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ ۱۴۸۹ء تا ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء) کی بیوی تھی۔ وہ بڑی بیدار مغز باہمت اور دور اندیش خاتون تھی۔ ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء میں یوسف عادل شاہ نے وفات پائی تو اس کا نابالغ بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت پر بیٹھا اور کمال خان دکنی نائب السلطنت مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد کمال خان کے دل میں خود بادشاہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی اور اس نے اپنے نابالغ آقا کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کی والدہ ملکہ پونچی خاتون کو کمال خان کے منصوبے کا علم ہوا تو اس نے اُس کا منصوبہ ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا مگر مشکل یہ تھی کہ دربار اور فوج کے بیشتر امراء کمال خان کے حامی تھے۔ اس نے اس صورتِ حال سے اسمٰعیل کی دایہ کے خاوند یوسف ترک کو آگاہ کیا تو وہ اپنے آقا کی خاطر جان قربان کرنے پر تیار ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ایک دن کمال خان کو قتل کر دیا اور خود بھی کمال خان کے حامیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ کمال خان کی بیوی نے اپنے لڑکے صفدر خان کو باپ کے خون کا بدلہ لینے پر ابھارا اور اس سے کہا کہ اسمٰعیل عادل شاہ اور پونچی خاتون کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر لو۔ صفدر خان نے فوراً فوج کو قلعے پر حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دیا۔ اُدھر قلعے میں پونچی خاتون کے پاس صرف چھ سو مغل دکنی اور حبشی سپاہی تھے۔ اس نے ان کو جمع کر کے کہا، "اسمٰعیل ابھی بچہ ہے دشمن چاہتا ہے کہ اس کو قتل کر کے خود تاج و تخت پر قبضہ کر لے تم میں سے جو ہمارے وفادار اور نمک حلال ہوں وہ قلعہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کریں اور جن کو اپنی جان پیاری ہے وہ قلعہ سے نکل جائیں۔ کفرانِ نعمت کرنے والوں کو ایک نہ ایک دن ضرور سزا ملے گی۔

پونچی خاتون کی تقریر سن کر تقریباً تین سو جانبازوں نے اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا باقی سب قلعہ سے نکل کر صفدر خان سے جا ملے۔ اب پونچی خاتون نے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور اپنے جاں نثاروں کو محل کی چھت پر کھڑا کر دیا پھر وہ خود، دل شاد آغا (اسمٰعیل عادل کی پھوپھی) چند دوسری خواتین اور اسمٰعیل عادل شاہ کو ساتھ لے کر محل کی سب سے اونچی جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ان خواتین نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا اور سب تیر و کمان سے لیس تھیں۔ اسی اثنا میں صفدر خان فوجِ گراں کے ساتھ قلعہ کے قریب پہنچ گیا اور اپنے سپاہیوں کو حملے کا حکم دیا۔ پونچی خاتون، دل شاد آغا اور ان کے جاں نثاروں نے حملہ آوروں پر تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی لیکن صفدر خان اپنا دباؤ برابر بڑھاتا جا رہا تھا۔ عین اس وقت عادل شاہی خاندان کا ایک قدیم نمک خوار مصطفیٰ آغا رومی پچاس توپچیوں کو لے کر پونچی خاتون کی مدد کو پہنچ گیا۔ بہادر خواتین نے اس کو دعائیں دیں اور رسے نیچے لٹکا کر اسے اور اس کے ساتھیوں کو اوپر کھینچ لیا۔ انہوں نے قلعے میں موجود توپوں سے حملہ آوروں پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔ اب صفدر خان نے اپنی ماں کے مشورے سے جنگی تدبیر بدل دی اور بڑی توپیں لگا کر قلعے کی دیواریں گرانے کی فکر میں لگ گیا۔ یہ دیکھ کر ملکہ پونچی خاتون نے اپنے تمام سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سب ادھر ادھر چھپ جائیں۔ جب وہ لڑائی چھوڑ کر چھپ گئے تو عورتیں اپنے اصل (زنانہ) لباس میں قلعے کی چھت پر کھڑی ہو گئیں۔ صفدر خان نے سمجھا کہ قلعہ کے لشکری پونچی خاتون کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور اب قلعے پر قبضہ کرنا معمولی بات ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو قلعے پر دوبارہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کی فوج بڑے جوش سے آگے بڑھی اور قلعے کا ایک دروازہ توڑ ڈالا۔ پھر وہ دوسرے دروازے پر حملہ آور ہوئی۔ اس وقت پونچی خاتون نے اپنے جاں نثاروں کو اشارہ کیا۔ وہ اللہ اللہ کے نعرے لگاتے حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے، اوپر سے خواتین نے بھی ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ صفدر خان کی آنکھ میں ایک تیر لگا اور اس نے گھبرا کر

قلعہ کی دیوار کے نیچے پناہ لی۔ پونجی خاتون ملکار ملکار کر اپنے جاں نثاروں کا دل بڑھا رہی تھی۔ اس نے صفدر خان کو قلعہ کی دیوار کے نیچے دیکھا تو اپنے بیٹے اسمٰعیل عادل شاہ کو اس پر ایک بڑا پتھر پھینکنے کا اشارہ کیا، اس نے ماں کے حکم کی تعمیل کی۔ صفدر خان یہ پتھر لگتے ہی مر گیا۔ فوج نے اپنے سردار کو مرتے دیکھا تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس فتح کے بعد اسمٰعیل عادل شاہ بلا کھٹکے حکومت کرنے لگا۔ اس نے اپنے کوکہ یوسف ترک کا جنازہ نہایت تزک و احتشام سے اٹھوایا اور اس کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ بنوایا۔ پونجی خاتون نے صفدر خان کی والدہ کے ساتھ بڑا فراخدلانہ برتاؤ کیا اور اسے عزت و احترام کے ساتھ ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

یہ پونجی خاتون کی شجاعت اور تدبیر و ہمت ہی کا نتیجہ تھا کہ یوسف عادل شاہ نے پچیس سال تک حکومت کی اور اس کے بعد بھی عادل شاہی خاندان بیجاپور پر ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک حکمران رہا۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم)

ملکہ آمنہ

برہان نظام شاہ (المتوفی ۹۶۱ھ ۱۵۵۴ء ہجری) والی احمد نگر کی نہایت چہیتی بیوی تھی۔ یہ خاتون زیورِ عقل و کمال سے آراستہ تھی، اور اس کو رفاہِ عام کے کاموں سے بے حد شغف تھا۔ اس کے بطن سے دو شہزادے حسین نظام شاہ اور عبدالقادر پیدا ہوئے۔ اگرچہ بادشاہ کے حرم میں اور بیویاں بھی تھیں مگر اس کو سب سے زیادہ آمنہ کا اکرام اور احترام مدِنظر رہتا تھا کیونکہ وہ اپنے اوصافِ حمیدہ کی بنا پر سب پر فوقیت رکھتی تھی۔ رفاہِ عام کے بے شمار کاموں کے علاوہ اس نے ۹۲۹ھ ۱۵۲۳ء میں ایک قصبہ آباد کیا جو آج بھی آمنہ پور کے نام سے موجود ہے اور اس نیک ملکہ کی یاد دلاتا ہے۔

(تاریخ فرشتہ)

ملکہ صفیہ

سلطنتِ عثمانیہ کے فرمانروا سلطان مراد ثالث (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء تا ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء) کی بادشاہ بیگم تھی۔ بڑی بیدار مغز خاتون تھی اور اُمورِ سیاست میں کمال درجے کی مہارت رکھتی تھی۔ سلطان مراد ثالث اُمورِ سلطنت سے جس قدر غافل تھا، ملکہ صفیہ اسی قدر ہوشیار تھی اور ملکی نظم و نسق پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اسی کی غیر معمولی لیاقت اور تدبر کی وجہ سے سلطان مراد نے بائیس برس تک اطمینان سے حکومت کی اور ملک میں عمومی طور پر امن و امان کا دور دورہ رہا۔ ملکہ صفیہ وینس کی رہنے والی تھی۔ اس نے اہلِ وینس کو ایسا رام کیا کہ انہوں نے اس کے عہد میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف کبھی کوئی ہنگامہ برپا نہ کیا۔ ملکہ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی بہت دلچسپی لیتی تھی اور ہمیشہ اہلِ ملک کو فائدہ پہنچانے میں کوشاں رہتی تھی۔ سلطان مراد ملکہ صفیہ کو بہت مانتا تھا اور اس نے اس کو بہت وسیع اختیارات دے رکھے تھے۔
سلطان مرادِ ثالث نے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں وفات پائی تو اس کا فرزند محمد ثالث تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں بھی ملکہ صفیہ کے اثر و رسوخ اور اقتدار کی وہی کیفیت رہی جو سلطان مراد کے عہد میں تھی۔

(سٹینلے لین پول)

بی بی صدقی

دسویں صدی ہجری میں ایک نامور ترک شاعرہ گزری ہے۔ بڑی عالمہ فاضلہ اور خدا پرست خاتون تھی۔ اس کا ایک دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کے علاوہ اس نے دو طویل مثنویاں بھی اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان پر تصوف کا رنگ غالب ہے اور یہ بڑی حد تک عارفانہ کلام ہے۔ بی بی صدقی بڑی پاکباز خاتون تھی اس لیے اس کا کلام حسن و عشق کی رنگینیوں سے خالی ہے۔ اس نے مدت العمر شادی نہیں کی۔

(مشاہیرِ نسواں)

مہر ماہ سلطان

سلطنتِ عثمانیہ کے دسویں فرمانروا سلطان سلیمان اوّل ذی شان[1]
(۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء تا ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء) کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام
مہر و ماہ بھی لکھا ہے۔ اس کی شادی وزیر اعظم رستم پاشا سے ہوئی۔ نہایت
با حمیت، دیندار اور مخیّر خاتون تھی۔ اس نے اپنی بے شمار دولت دینی اوقاف
کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان اوقاف میں سب سے اہم اس کی تعمیر کرائی ہوئی
دو عظیم الشان مسجدیں تھیں۔ ایک شہر سقوطری یا اشقودرہ (SCUTARI)
کے گھاٹ کے قریب اور دوسری استنبول (قسطنطنیہ) میں باب ادرنہ کے
قریب۔ یہ مسجدیں اسی کے نام پر مشہور ہوئیں۔ اوّل الذکر مسجد اس دَور

---

[1] سلطان سلیمان اوّل سلطنتِ عثمانیہ کا دسواں اور سب سے بڑا فرمانروا تھا۔
بعض مسلمان مؤرخین نے اس کو "سلیمانِ اعظم" لکھا ہے۔ ترک اسے سلطان سلیمان قانونی
کہتے ہیں، اور مغربی مصنفین "سلیمان ذی شان" (SOLIMAN THE MAGNIFICIENT)
لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت نصف صدی پر محیط اس کی حکومت بحر و بر میں ترکوں کے انتہائی
عروج کا زمانہ تھا۔ سلطان سلیمان نہایت دانشمند، جواں مرد، شجاع، فیاض اور باوقار حکمران
تھا۔ وہ ملک کا نظم و نسق قائم رکھنے اور سلطنت کے انتظام کا آئین اور قواعد مرتب
کرنے میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا اسی لیے اسے سلیمان قانونی کہا جاتا ہے۔
سلطان سلیمان بہت بڑا فاتح تھا اس نے بلگریڈ، رودس، ہنگری، جزیرہ نما کریمیا،
موصل، بغداد، بصرہ، عدن، طرابلس اور الجزائر کے علاوہ شمالی افریقہ کے ایک بڑے علاقے
کو اپنے زیرِ نگین کر لیا۔ صوبہ مصر کی حدود کو وسعت دے کر نوبیہ (سوڈان) تک پہنچا
دیا اور آسٹریا کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے عہد میں ترکوں کی بحری قوت کو بھی بڑا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے نامور معمار سنان پاشا کے کمالِ فن کا شاہکار تھی جسے اس نے ۹۵۴ھ / ۱۵۴۷ء میں تعمیر کیا۔

رستم پاشا سے مہرماہ سلطان کے دو بیٹے جہانگیر اور بایزید اور ایک بیٹی عائشہ خانم تھی۔ بیٹوں کے ختنہ کی تقریب اس نے اس شان سے کی کہ وہ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

عروج نصیب ہوا۔ اور وہ سارے بحیرۂ روم، بحیرۂ قلزم، بحرِ عرب اور بحرِ ہند پر چھا گئے امیر البحر خیرالدین باربروسہ سلطان سلیمان ہی کی بحری فوج کا سالارِ اعظم تھا۔ اس نے یورپ کی کئی حکومتوں کو بحری لڑائیوں میں شکست دی۔ اس زمانے میں ہسپانیہ (اسپین) کو دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت سمجھا جاتا تھا، وینس کا ملک بھی بحری قوت کے لحاظ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ۹۴۵ھ / ۱۵۳۸ء میں پری ویسا کے مقام پر ہسپانیہ اور وینس کے متحدہ جنگی بیڑے کا ترکوں کے جنگی بیڑے سے مقابلہ ہوا۔ پوپ نے بھی ہسپانیہ کی مدد کے لیے جنگی جہاز بھیجے تھے لیکن امیر البحر خیرالدین باربروسہ نے اس معرکے میں دشمن کے متحدہ جنگی بیڑے کو ایسی کمر توڑ شکست دی کہ وہ مدتوں اپنے زخم چاٹتا رہا۔

سلطان سلیمان کی شہرت و عظمت صرف اس کے جنگی کارناموں اور فتوحات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اس نے اپنی وسیع سلطنت کا انتظام ایسی خوش اسلوبی سے کیا کہ رعایا نہایت آسودہ اور خوشحال ہو گئی۔ اس نے نظمِ حکومت کے جو قوانین بنائے ان کی بنا پر اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے قانون سازوں میں ہوتا ہے۔ ملا ابراہیم حلبی نے اس کے بنائے ہوئے قوانین کو کتابی صورت دے دی تھی۔ ان قوانین پر عثمانی فرمانروا عرصہ تک عمل کرتے رہے۔ سلطان سلیمان اعظم نے ۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء میں وفات پائی۔

(تاریخِ اسلام۔ خلافتِ عثمانیہ)

تاریخی واقعہ بن گیا۔

بیٹی کی شادی وزیرِ اعظم احمد پاشا سے ہوئی۔ رستم پاشا نے ۹۶۸ھ / ۱۵۶۱ء میں وفات پائی اس کے بعد مہر ماہ سلطان نے اپنے فاتح اعظم والد کو بڑے اصرار کے ساتھ جزیرہ مالٹا پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے چار سو جنگی کشتیاں اپنے صرف سے تیار کرنے کی پیش کش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے ثواب کی حقدار ہو جائے۔

مہر ماہ سلطان نے ۹۸۵ھ / ۱۵۷۸ء میں وفات پائی۔ اس کو استنبول میں اپنے والد کے مقبرہ میں اس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

(مشاہیر نسواں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲۱)

جانفدا قادین

سلطنتِ عثمانیہ کے بارھویں فرمانروا سلطان مراد ثالث (۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء تا ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء) کی ملکہ تھی۔ یہ خاتون بڑی دانشمند، مخیر، انصاف پسند اور امورِ سیاست میں ماہر تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملکی نظم ونسق میں پورا پورا حصہ لیتی تھی اور سلطان اس کی رائے کو دوسرے عمائدِ حکومت کی رائے پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ رعایا کی بے حد خیر خواہ تھی اور اس پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بدقسمتی سے اس کا حقیقی بھائی بہت ظالم اور سفاک تھا۔ ملکہ نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ زیردستوں پر ظلم توڑنے سے باز آجائے لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس پر ملکہ نے اس کو قید کرا دیا۔

ملکہ جانفدا قادین نے استنبول اور ترکی کے دوسرے شہروں میں بہت سی مسجدیں اور سبیلیں تعمیر کرائیں جن میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں۔

(مشاہیرِ نسواں)

شہزادی فاطمہ خانم

ملکہ زبیدہؒ (م ۲۱۶ھ / ۸۳۱ء) کے حالات میں نہر زبیدہ کا ذکر آچکا ہے۔ ملکہ زبیدہ کے بعد آنے والے مسلمان حکمرانوں نے اس نہر کی دیکھ بھال جاری رکھی لیکن تقریباً سات سو سال بعد مکے کے تمام چشمے اور کنوئیں خشک ہو گئے۔ نہر زبیدہ بھی پتھروں اور ریت سے پُر ہو گئی اور جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔ اس میں پانی بہت کم رہ گیا اور ایک بار پھر مکہ میں پانی کی قلت ہو گئی۔ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء ہجری میں تو مکے کی حالت بالکل ویسی ہی ہو گئی جیسی نہر زبیدہ کے جاری ہونے سے پہلی تھی۔ ان حالات کی خبر ایک نیک دل ترک شہزادی فاطمہ خانم کو پہنچی تو وہ بے چین ہو گئی۔ فاطمہ خانم ترکی کے ایک عثمانی فرمانروا سلطان سلیم کی دختر نیک اختر تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ایسا انتظام کرے گی جس سے مکہ کے گھر گھر میں پانی پہنچ جائے اور حاجیوں کو بھی ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے اس نے اپنے ایک معتمد ملازم ابراہیم بن تکرین کو پچاس ہزار اشرفیاں دے کر حکم دیا کہ مکہ معظمہ جا کر پہلے تو نہر زبیدہ کی صفائی اور مرمت کراؤ اور پھر اس کو "چاہِ زبیدہ" سے خاص مکہ معظمہ شہر تک پہنچانے کا انتظام کرو۔

ابراہیم بن تکرین نے مکہ معظمہ جا کر مصر شام اور یمن وغیرہ سے بڑے بڑے انجنیئروں اور کاریگروں کو جمع کیا اور انہیں سینکڑوں مزدور دے کر نہر کی صفائی پر لگا دیا۔ ان لوگوں نے سخت محنت کر کے نہر کو صاف کیا اور جہاں جہاں سے یہ ٹوٹ گئی تھی اس کی مرمت کی۔ اس کے بعد انہوں نے نہر کو چاہِ زبیدہ سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑی چٹان ہے جو دو ہزار فٹ دور تک چلی گئی ہے، اس کی موٹائی پچاس فٹ اور چوڑائی کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔

اس چٹان کو کاٹنا ناممکن نظر آتا تھا، اس لیے ابراہیم ہمت ہار بیٹھا اور فاطمہ خانم کو اطلاع دی کہ چٹان کی وجہ سے نہر کو چاہِ زبیدہ سے آگے بڑھانا ممکن نہیں۔ شہزادی بڑی باہمت خاتون تھی، اس نے ابراہیم کو ایک سخت فرمان بھیجا جس میں لکھا کہ اس چٹان کو ہر قیمت پر کاٹ کر نہر کو مکہ معظمہ تک پہنچاؤ۔ چنانچہ سینکڑوں مزدور بیسیوں انجنیئروں کی نگرانی میں اس چٹان کو کاٹنے کے کام میں جٹ گئے۔ اس زمانے میں نہ ڈائنامیٹ ایجاد ہوا تھا اور نہ ایسی بڑی بڑی مشینیں تھیں جن سے آج کل پہاڑ کاٹنے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پتھروں پر مسلسل آگ جلاتے رہتے تھے۔ جب وہ کچھ نرم ہو جاتے تو انہیں تیز دھار آلوں سے کاٹتے تھے۔ دس سال تک وہ لگاتار اسی طرح محنت کرتے رہے اور شہزادی فاطمہ خانم ان کو دل کھول کر مزدوری دیتی رہی۔ آخر وہ مبارک دن آگیا جب ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں چٹان کی رکاوٹ دور ہو گئی اور نہر مکہ معظمہ تک پہنچ گئی۔ اس دن اہلِ مکہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے دعوتیں کیں اور غریبوں اور محتاجوں کو دل کھول کر خیرات دی۔ حکومت کی طرف سے بھی انجنیئروں اور مزدوروں کو نقد رقم اور قیمتی پارچات کی صورت میں انعامات دیئے گئے۔ اس نیک کام کی بدولت شہزادی فاطمہ خانم کو "ملکہ زبیدہ ثانی" کہا جاتا ہے۔

(ماہنامہ "الحسنات" رامپور)

شاہ سلطان

ترکی کے فرمانروا سلطان سلیم اوّل (۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ / ۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء) کی بیٹی اور لطفی پاشا کی اہلیہ تھی۔ بڑی باخدا نیکوکار اور مخیر خاتون تھی۔ اس نے ایک عظیم الشان جامع مسجد اور ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس خانقاہ کو بعد میں مدرسہ کی شکل دے دی گئی۔

(مشاہیر النساء)

گیارھویں صدی ہجری

۱۔ جاناں بیگم (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ، نیک سیرت)
۲۔ آنی فاطمہ ——— (شاعرہ)
۳۔ ملکہ نور جہاں (عالمہ، ادیبہ، شاعرہ مخیرہ، حسنِ صورت و سیرت میں یکتائے زمانہ)
۴۔ ملکہ ارجمند بانو ممتاز محل (سلیقہ شعار، دانا، باوفا)
۵۔ جہاں آرا بیگم (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ، مصنفہ ——— خوش عقیدہ، مخیرہ)
۶۔ ملکہ ترکان خاتون (عالی حوصلہ، سخی، عبادت گزار)
۷۔ روشن آرا بیگم (عالمہ، فاضلہ، کاتبہ، مخیرہ ——— بیدار مغز)
۸۔ ملکہ اعز النساء بیگم (دیندار، باخدا، مخیرہ)
۹۔ ستی النساء (عالمہ، فاضلہ، طبیبہ، قاریہ)
۱۰۔ ملکہ امِ احمد (نیک سیرت، دیندار، مخیرہ)
۱۱۔ مائی لاڈو ——— (دیندار، باخدا)
۱۲۔ بی بی گلشن ——— (شاعرہ)
۱۳۔ شہزادی نادرہ بیگم (باوفا بیوی، حسنِ صورت و سیرت ——— میں یکتا)
۱۴۔ شہزادی زیب النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، حافظہ شاعرہ، ادیبہ، معارف پرور سخی)
۱۵۔ شہزادی زینت النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، شاعرہ ——— دیندار، سخی، معارف پرور)
۱۶۔ شہزادی بدر النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، حافظہ)
۱۷۔ شہزادی زبدۃ النساءؒ (عالمہ، فاضلہ، دیندار ——— پابندِ شرع)
۱۸۔ ملکہ ماہ پیکر (دانشمند، عالی حوصلہ، مدبرہ)
۱۹۔ بی بی صاحب جی (حسنِ صورت و سیرت میں یکتا، ہوشمند، سلیقہ شعار)
۲۰۔ بی بی جمال خاتونؒ ——— (عارفہ)
۲۱۔ ملک شاد خانم ——— (خطاطہ)

جانان بیگم

عبدالرحیم خانخاناں[1] کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے آراستہ تھی۔ مکارمِ اخلاق اور لیاقتِ علمی کے اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتی تھی۔ دین سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے قرآنِ مجید کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی تھی۔ حجِ بیت اللہ

---

[1] عبدالرحیم خانخاناں بن بیرم خان خانخاناں عہدِ اکبری و جہانگیری کا نامور امیر ہوا ہے۔ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ / ۱۷ دسمبر ۱۵۵۲ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ خود بھی نہایت اونچے درجے کا عالم تھا اور اربابِ علم کا قدر شناس اور مربی تھا۔ اس کو فارسی ترکی اور ہندی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ عربی میں بھی دستگاہِ کامل رکھتا تھا، تفسیر حدیث فقہ ریاضی ہیئت اور فلسفہ وغیرہ میں بھی اس کو درجۂ تبحر حاصل تھا۔ فارسی اور ہندی میں اس کا کافی کلام ابھی تک محفوظ ہے۔ اکبر کی فرمائش پر تزکِ بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

نہایت دریا دل اور سخی تھا۔ اس کی فیاضی اور سخاوت کے واقعات پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ شجاعت میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ سخاوت اور علم دوستی کے واقعات کے علاوہ اس کی بہادری اور جنگی قابلیت کے واقعات بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ وہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ اس کو کتابوں سے بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جس میں نادر اور نایاب کتابوں کی بہت بڑی تعداد جمع کر دی۔ مؤرخین نے اس کتب خانے کی بیحد تعریف کی ہے۔ اس عظیم شخصیت نے جمادی الآخر ۱۰۳۶ھ (فروری ۱۶۲۷ء) میں دلی میں وفات پائی۔ بستی خواجہ نظام الدین اولیاء میں اس کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے۔

شرف بھی حاصل کیا۔ شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد باقی زندگی بیوگی کے عالم میں گزار دی۔ ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ نے اس کو نکاح کا پیغام بھیجا لیکن اس نے معذرت کر دی ۔۔ ہمیشہ پاک دامن اور عفت شعار رہی ۔ شعر و سخن نہایت عمدہ ذوق رکھتی تھی۔ تذکروں میں اس کے یہ تین شعر محفوظ رہ گئے ہیں:

عاشق ز خلق عشق تو پنہاں چساں کند
پیداست از دو چشم تر بشں خوں گریستن

زراہِ امن و سلامت کسے بہ او نرسد
غبار تا نشود خاکِ پا بہ او نرسد

خیز تا رہ بہ رہ گزار کنیم
خویش را چشم انتظار کنیم

جاناں بیگم نے ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء ہجری میں وفات پائی۔ (اختر تاباں بمشاہیر نسواں)

آئی فاطمہ

گیارہویں صدی ہجری میں استنبول (ترکی) کی رہنے والی یہ خاتون علم و ادب اور شعر و سخن میں یکتائے زمانہ تھی۔ وہ خواجہ سعد الدین حسنجانی مصنف "تاج التواریخ" کی اولاد سے تھی۔ اس کا شوہر امیر آغا تھا اور اس کا بیٹا نیکی شہر کا قاضی تھا۔ وہ ترکی زبان کی نغز گو شاعرہ تھی۔ اس کا دیوان مرتب ہو چکا ہے۔ اس باکمال خاتون نے ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء میں نیکی شہر میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ نور جہاں (مہر النساءؑ)

اعتماد الدولہ میرزا غیاث بیگ کی بیٹی اور نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ کی چہیتی ملکہ تھی۔ میرزا غیاث بیگ کا تعلق ایران کے ایک معزز خاندان سے تھا اور اس نے بڑی اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس کا والد میرزا محمد شریف پہلے محمد خان تکلو حاکم خراسان کا وزیر اور بعد میں شاہ طہماسپ صفوی اول (سنہ ۹۳۰ھ تا سنہ ۹۸۴ھ ۱۵۲۴ء ۱۵۷۶ء) کی طرف سے حاکم مرد (MERV) مقرر ہوا۔ اس خاندان پر کسی وقت ایسی افتاد آ پڑی کہ میرزا غیاث بیگ کو اہل و عیال سمیت بحالِ خستہ تلاشِ روزگار کے لیے ایران سے نکلنا پڑا۔ دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اثنائے سفر میں قندھار کے نزدیک اس کی اہلیہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا جس کا نام مہر النساء رکھا گیا۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں بعض تذکرہ نگاروں نے ایک عجیب کہانی لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ مہر النساء ایک جنگل میں پیدا ہوئی۔ ماں باپ سفر کی صعوبتوں اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں اس ننھی سی جان کو اپنے ساتھ لے جانا انہیں بہت مشکل نظر آیا اس لیے انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر بچی کو ایک درخت کے سائے میں لٹا دیا اور خود آگے بڑھ گئے۔ کرنا خدا کا ان کے پیچھے ایک اور قافلہ وہاں پہنچا۔ قافلے کے سردار نے سنسان جنگل میں ایک نومولود بچی کو بے کسی کی حالت میں پڑا دیکھا تو اس کو ترس آ گیا اور اس نے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے لیا۔ جب اگلا پڑاؤ آیا تو اس نے اِدھر اُدھر آدمی بھیجے کہ کسی انا کی تلاش کریں جو اس بچی کو دودھ پلا سکے۔ حسنِ اتفاق سے اسی پڑاؤ پر میرزا غیاث ٹھہرا ہوا تھا۔ سردار کے آدمی اس کے پاس پہنچے تو اس نے اپنی بیوی کی خدمات پیش کیں۔ بیوی نے جا کر دیکھا تو وہ اس کی اپنی بچی تھی بے تاب ہو کر سینے سے لگا لیا۔ سردار کو واقعہ کا علم ہوا تو اس نے بچی کو ماں کے سپرد کر دیا اور ان لوگوں کو ہندوستان پہنچنے میں مدد دی۔

میرزا غیاث بیگ ہندوستان پہنچا تو اس کی اکبر بادشاہ کے دربار میں رسائی ہو گئی اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت کی بدولت دیوانِ بیوتات مقرر ہو گیا اور بادشاہ سے اعتماد الدولہ کا خطاب پایا۔ میرزا غیاث بیگ معاملہ فہمی کے علاوہ ایک اچھا خوشنویس، انشاء پرداز اور نغز گو شاعر بھی تھا اور اس کا دستِ سخاوت بھی بہت کشادہ تھا۔ (مگر جہانگیر نے اپنی تزک میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے باوصف میرزا غیاث بیگ رشوت لیے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ جہانگیر کا اپنا تجربہ تھا یا اس نے سنی سنائی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا)

مرزا غیاث بیگ نے مہرالنساء کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت ذہین و فطین لڑکی تھی۔ اس نے قرآن مجید ختم کرنے کے بعد چند ہی سال میں مختلف علوم میں دسترس حاصل کر لی اور فارسی جو اس کی مادری زبان تھی اس کے شعر و ادب میں بھی ماہرانہ دستگاہ پیدا کر لی۔ اس کے علاوہ وہ امورِ خانہ داری میں بھی طاق ہو گئی اور اپنی والدہ کے ساتھ شاہی محل میں بکثرت آمد و رفت سے ادب، تمیز اور سلیقہ کے اعتبار سے بھی شہزادیوں کے ہم پلّہ نظر آنے لگی۔ جب شادی کی عمر کو پہنچی تو والدین نے اسے شاہی دربار سے وابستہ ایک لائق ایرانی نوجوان علی قلی خان سے بیاہ دیا۔ بادشاہ نے علی قلی خان کی خدمات سے خوش ہو کر (یا غیر معمولی بہادری دکھلانے پر) اس کو شیر افگن کا خطاب دیا تھا (ایک روایت یہ ہے کہ یہ خطاب اس کو جہانگیر نے شہزادگی کے زمانے میں دیا تھا) شیر افگن اور مہرالنساء کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار رہی۔ ان کو اللہ نے ایک بیٹی دی جس کا نام انہوں نے لاڈلی بیگم

ـــــــــــ

ھ جہانگیر اپنی "تزک" میں لکھتا ہے:-

"میرے والد مجھ سے بے التفاتی ظاہر کرتے تھے اس لیے ان کی یہ بے رُخی دیکھ کر میرے اکثر ہمراہی مجھ سے جُدا ہو گئے۔ ان میں علی قلی خان بھی تھا۔ حالانکہ میں نے اس پر بڑی بڑی عنایات کی تھیں۔ اس پر بھی میں نے بادشاہ ہو کر اس کی تقصیرات معاف کر دیں اور اس کو بنگالہ میں جاگیر عطا

کی لیکن وہاں اس نے بادشاہی آدمیوں سے فساد شروع کر دیا میں نے
اپنے دودھ شریک بھائی (کوکا) قطب الدین خاں کو اس کی تنبیہ کے
لیے بھیجا لیکن علی قلی خاں نے اس کو قتل کر دیا۔ قطب الدین کے ساتھی
ایک کشمیری رئیس زادہ انبہ خان نے جو والیانِ کشمیر کی اولاد سے تھا
اور جو ایک ہزاری ذات اور تین سو سوار کے منصب سے سرفراز تھا،
علی قلی کے ساتھ دست بدست لڑائی کی اس لڑائی میں دونوں ایک دوسرے
کے ہاتھ سے مارے گئے۔"

شیر افگن کے قتل کے بعد اعتماد الدولہ (میرزا غیاث بیگ) نے اپنی بیوہ
بیٹی کو اکبر کی بیوہ اور جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی خدمت گزاری کے لیے
اس کے محل میں بھیج دیا۔ وہیں ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء کے جشن نوروز میں جہانگیر نے اس کو
دیکھا اور اس کے حسنِ خداداد اور عادات و اطوار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی
سوتیلی والدہ کی معرفت اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ مہر النساء رضامند ہو گئی
اور دو ماہ بعد اس کی جہانگیر سے شادی ہو گئی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ
جہانگیر مہر النساء کو اپنی شہزادگی کے زمانے سے چاہتا تھا اور اس نے شیر افگن
کو اسی لیے مروایا تھا کہ وہ مہر النساء سے شادی کر سکے۔ لیکن یہ سب من گھڑت
اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ کسی مستند تاریخ سے ان کا ثبوت نہیں ملتا۔

حرم شاہی میں داخل ہونے کے بعد مہر النساء کا ستارۂ اقبال روز بروز بلند
ہوتا گیا۔ اپنی لیاقت، سلیقہ شعاری اور دانش مندی کی بدولت وہ جہانگیر کے
مزاج پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔ بادشاہ نے اسے پہلے نور محل اور پھر نور جہاں
کا خطاب دیا۔ یہ خطاب ایسا مشہور اور مقبول ہوا کہ بقول مولانا محمد حسین آزاد مرحوم
"حرم سرائے میں ایک سے ایک بڑھ کر رانیاں تھیں لیکن نور جہاں نے سب کے
چراغ بے نور کر دیے۔ صرف خطبہ میں اس کا نام نہیں پڑھا جاتا تھا باقی تمام لوازمِ
سلطنت میں اس کا دخل تھا۔" جہانگیر کے حکم سے نور جہاں کے نام کا یہ سکہ بھی

بھی جاری ہوا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور   بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

جہانگیر اسے سفر و حضر میں ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ شکار پر بھی اس کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں وہ فتح پور سیکری کے قریب شکار کھیل رہا تھا کہ نور جہاں نے بندوق کی پہلی ہی گولی سے شیر کو مار ڈالا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کی بہادری کی بہت تعریف کی۔ کہا جاتا ہے کہ نور جہاں نے ایک اور موقع پر چار شیر مارے۔ ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے شہریار کی منگنی نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم سے کر دی۔ لاڈلی بیگم شیر افگن کی صلب سے تھی اور شہریار جہانگیر کی ایک دوسری بیوی (یا کنیز) کے بطن سے تھا۔ جہانگیر یہ رسم ادا کرنے کے لیے خود اعتماد الدولہ (نور جہاں کے باپ اور لاڈلی بیگم کے نانا) کے گھر گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

"میں نے اس مسرت بخش موقع پر سعادت مند فرزند شہریار کو آٹھ ہزار پیادوں اور چار ہزار سواروں کا منصب عطا کیا اور اسے درازئ عمر اور اقبال مندی کی دعا دی۔" (ص ۶۷۰)

منگنی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جہانگیر نے شہریار اور لاڈلی بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ اس کے بعد نور جہاں نے درباری سیاست میں پس پردہ رہ کر بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا مقصد اپنے داماد شہریار کے لیے جہانگیر کی جانشینی کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جہانگیر کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ اس کی صحت کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جہانگیر بلانوش تھا مگر نور جہاں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ حد اعتدال کے اندر رہے۔ رفتہ رفتہ وہ جہانگیر کے مزاج میں اس قدر دخیل ہو گئی کہ بادشاہ کے اپنے الفاظ میں:۔

"میں نے سلطنت نور جہاں بیگم کو بخش دی۔ مجھے ایک سیر شراب

اور نصف سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔"[۱]

(اقبال نامۂ جہانگیری ص ۶۴)

نوبت یہاں تک پہنچنے کے باوجود جہانگیر نے عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس معاملے میں وہ نورجہاں کی بھی رو رعایت کرنے کا روادار نہ تھا۔ اس نے نورجہاں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "بیگم سلطنت بیشک تمہاری ہے مگر خبردار کسی سے بے انصافی نہ کرنا۔"

ایک دو موقعوں پر بعض لوگ نورجہاں کی زیادتی کا شکار ہوئے تو جہانگیر نے اس کا سختی سے محاسبہ کیا اور جب تک اس نے مظلوموں کو کچھ دے دلا کر راضی نہ کر لیا جہانگیر نے اس کو معاف نہ کیا۔

شہزادہ خرم (شاہجہاں) جہانگیر کا سب سے لائق بیٹا تھا۔ وہ نورجہاں کے بھائی میرزا ابوالحسن آصف جاہ کا داماد تھا۔ نورجہاں نے شہریار کو آگے بڑھانے اور شہزادہ خرم کو بادشاہ کی نظروں سے گرانے کے لیے ایسی چالیں چلیں کہ جہانگیر اور شہزادہ خرم کی آپس میں ٹھن گئی۔ جہانگیر نے مہابت خاں کی مدد سے شہزادہ خرم کی بغاوت کو فرو کیا اور اس خدمت کے صلے میں مہابت خاں کو خانِ خاناں سپہ سالار کا خطاب دے کر سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دو اسپہ وسہ اسپہ سواروں کے منصب پر ترقی دی اور اس کے بیٹے خانہ زاد خان کو پانچ ہزاری ذات وسوار

---

[۱] ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں جہانگیر شدید بیمار ہو گیا۔ اس بیماری میں نورجہاں نے بڑی تندہی سے اس کی تیمارداری کی۔ شوہر کی بحالی صحت کے لیے اس نے جو خدمات انجام دیں اور جو تدابیر اختیار کیں ان سے جہانگیر بہت ہی خوش ہوا اور نورجہاں کو اپنی محسنہ قرار دیا۔ اس نے برملا نورجہاں کی خدمات کا اعتراف کیا اور دل کھول کر اس کی تعریف و توصیف کی۔ اس حسنِ خدمت کی وجہ سے وہ جہانگیر کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا گئی اور عملاً وہی حکمران بن گئی۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ آئندہ شاہی نوبت کے بعد اس کے لیے بھی نوبت بجا کرے۔ اس سے پہلے نوبت کا بجنا صرف بادشاہ کے لیے مخصوص تھا۔

کے منصب پر ترقی دی۔ بعد میں نورجہاں نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے تحت بادشاہ کو مہابت خاں کے خلاف کر دیا۔ پہلے اسے صوبہ بنگال کا صوبہ دار مقرر کرایا۔ اس کے بعد اس کو حکم ہوا کہ وہ ہاتھی جو بنگال میں اس کے ہاتھ آئے تھے وہ دربار میں بھیج دے۔ اس کے علاوہ شاہی محاصل اور واجبات کا حساب خود دربار میں حاضر ہو کر دے۔ مہابت خاں نے سارے ہاتھی فوراً بھیج دیئے اور خود دربار میں حاضری دینے کے لیے روانہ ہوا لیکن ایک طرف اس کی حاضری میں رکاوٹ پیدا کی گئی اور دوسری طرف اس کے داماد خواجہ برخوردار نقشبندی (ابنِ خواجہ عمر نقشبندی) کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر ایک سرکردہ شاہی عہدیدار (مہابت خان) کی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ صرف گرفتاری پر ہی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اس کو بید لگوائے گئے، اور جو کچھ اس کی بیوی کو جہیز میں ملا تھا اسے بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا۔ اس واقعہ نے مہابت خاں کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب جہانگیر اور نورجہاں کابل جا رہے تھے مہابت خاں نے دریائے جہلم کے کنارے جہانگیر اور نورجہاں دونوں کو حراست میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا مگر نورجہاں نے ایسی عقلمندی اور ہوشیاری دکھائی کہ مہابت خاں کا زور ٹوٹ گیا اور اس نے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔

نورجہاں کی سیاسی زندگی کے حالات بڑی تفصیل کے متقاضی ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء میں نورجہاں، جہانگیر کے ساتھ کشمیر گئی۔ وہاں جہانگیر سخت بیمار ہو گیا۔ نورجہاں نے اس کی تیمارداری اور خدمت میں دن رات ایک کر دیئے مگر جہانگیر کا وقتِ آخر آ چکا تھا۔ اس نے ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (مطابق ۷ نومبر ۱۶۲۷ء) کو پیر پنجال کے قریب وفات پائی۔ نعش لاہور لائی گئی اور نورجہاں کے "باغِ دلکشا" میں دفن کی گئی۔ قبر پر شاہجہاں کے حکم سے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ نورجہاں نے اس کی تعمیر میں ذاتی دلچسپی لی اور جب تک یہ تیار نہ ہو گیا برابر تعمیر

کے کام کی نگرانی کرتی رہی۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد تخت نشینی کے سلسلے میں نور جہاں کی اپنے بھائی آصف جاہ کے ساتھ کچھ عرصہ کشمکش رہی۔ وہ اپنے داماد شہریار کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی جبکہ آصف جاہ اپنے داماد شہزادہ خرم کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا دونوں نے سیاسی داؤ پیچ لڑائے۔ ان میں آصف جاہ غالب آیا اور شہزادہ خرم شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے تاج و تخت کا مالک بن گیا۔ شہریار کی آنکھوں میں پہلے سلائی پھرا دی گئی اور پھر چند دن بعد کچھ دوسرے شہزادوں کے ساتھ اسے قتل کرا دیا گیا۔

اب نور جہان نے سیاست میں حصہ لینا بالکل چھوڑ دیا اور ملکی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگی۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد وہ اٹھارہ سال زندہ رہی۔ یہ سارا عرصہ اس نے لاہور میں گزارا۔ شاہجہاں نے اس کا دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جہانگیر کی زندگی میں وہ بڑی پر تکلف زندگی گزارتی تھی۔ اس نے زیور، پوشاک، بناؤ سنگار اور دیگر آرائش کی چیزوں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ گلاب کا عطر بھی اسی کی ایجاد ہے۔ مگر جہانگیر کی موت کے بعد اس نے بہت سادہ زندگی اختیار کر لی۔ اپنے وظیفے کا بیشتر حصہ علم کی اشاعت، صدقہ و خیرات اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش پر صرف کر دیتی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے پانچ سو سے زیادہ غریب لڑکیوں کی شادیاں اپنی گرہ سے کرائیں اور جہیز وغیرہ کے تمام اخراجات اپنے پاس سے ادا کیے۔ اس نے جہانگیر کی زندگی ہی میں اپنے باپ اعتماد الدولہ (وفات ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۲ء) کا مقبرہ آگرہ میں اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کرایا۔ ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب۔ بھارت) میں ایک خوش وضع خوش منظر پختہ اور سنگین سرائے تعمیر کرائی جو نور محل کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی نام سے ایک قصبہ وہاں آباد ہو گیا۔ لاہور میں بھی کچھ عمارات بنوائیں۔ نور جہاں نے بہ اختلافِ روایت ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ یا یکم ربیع الثانی ۱۰۵۵ھ مطابق ۲۷ مئی ۱۶۴۵ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ

شاہدرہ (لاہور) میں مقبرۂ جہانگیر کے قریب واقع ہے۔ لاڈلی بیگم بھی وفات کے بعد وہیں دفن ہوئی۔

نورجہاں کی زندگی کا ایک خاص پہلو شعروادب سے اس کی دلچسپی ہے۔ وہ ایک خوش فکر اور نازک خیال شاعرہ تھی اور نہایت علم دوست، بذلہ سنج اور حاضر جواب خاتون تھی۔ تاریخ اور تذکروں میں اس کی معارف پروری، علمی استعداد، سخن فہمی اور سخن سنجی کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ صاحب "مراۃ الخیال" نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"دربذلہ سنجی وسخن گوئی وشعر فہمی وحاضر جوابی از نسائے زماں ممتاز بود۔"

آزاد بلگرامی "ید بیضا" میں کہتے ہیں:

"دروادئ شعر بسیار خوش سلیقہ بود"

شاہنواز خان نے "مآثر الامراء" میں لکھا ہے کہ نورجہاں مخفی تخلص کرتی تھی مگر مولانا عبدالباری آسی نے "تذکرۃ الخواتین" میں اس کا تخلص نور بیان کیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نورجہاں کی بذلہ سنجی، برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

ایک دفعہ جہانگیر کئی روز تک نورجہاں سے نہ مل سکا۔ جب وہ ملا تو فرط مسرت سے نورجہاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جہانگیر نے اس کیفیت سے متاثر ہو کر یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

گوہر ز اشکِ چشم تو غلطیدہ می رود

نورجہاں نے برجستہ دوسرا مصرعہ کہا: ع

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ایک مرتبہ رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہوا اور عید کا چاند دکھائی دیا۔ جہانگیر

اور نورجہاں دونوں نے بالاخانۂ شاہی سے چاند دیکھا۔ اس وقت جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ع

ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کہا: ——— ع

کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

محرم ۱۰۲۸ھ ہجری میں ایک دمدار ستارہ نظر آیا۔ نورجہاں نے اسے دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا ؎

ستارہ نیست بدیں طول سر برآوردہ

فلک بشاطریٔ شہ کمر برآوردہ

ایک مرتبہ جہانگیر کی نظر ایک بوڑھے پر پڑی جس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے جُھک گئی تھی۔ جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: — ع

چرا خم پشت می کردند پیرانِ جہاں دیدہ

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کہا: - ع

بزیرِ خاک می جویند ایامِ جوانی را !!

ایک مرتبہ جہانگیر نے لباس تبدیل کیا۔ اس کی قبا پر لعلِ بے بہا کا تکمہ تھا۔ نورجہاں کی نظر پڑی تو فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

ترا نہ تکمۂ لعل است بر قبائے حریر

شدہ است قطرۂ خوں منّت گریباں گیر!!

ایک دن جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ع

از برائے سوزِ دل آتش زِ طور آوردہ است

نورجہاں نے فوراً کہا: - ع

تاجرِ ما جنسِ درد از راہِ دور آوردہ است

تذکروں اور تاریخوں میں نورجہاں کے جو اشعار ملتے ہیں ان میں سے یہ

یہ ہیں :

باین حسن وکمالاتے چو در گلشن گزر سازم	ز جانِ بلبلاں شورِ مبارکباد برخیزد
چو بردارم ز رخ برقعہ ز گل فریاد برخیزد	زنم بر زلف گر شانہ ز سنبل داد برخیزد

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار ست	کلید قفل دلِ ما تبسم یار ست
نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف	دلِ کسے کہ بحسن و ادا گرفتار ست

عشقت چناں گداخت تنم را کہ آب شد	گردی کساند سرمۂ چشمِ حباب شد

تہِ زلف خالش بلائے نہاں است	مترس از بلا ہا کہ شب درمیاں است

نامِ تو بردم وزدم آتش بجانِ خویش	در آتشم چو شمع ز دستِ زبانِ خویش

بینی و چشم و دو ابروئے تو اے گل اندام	شاخِ بادام و دو بادام و دو برگِ بادام

ز نارِ عشق اگر ظاہر کنم گل در چمن سوزد
اگر نالم بخلوتخانہ شمعِ انجمن سوزد

(تزکِ جہانگیری۔
مشاہیرِ نسواں۔ معارف لاہور جنوری ۱۹۸۱ء۔ نقوش لاہور نمبر
ہمدرد صحت ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۰ء
تحریک احیائے اسلام اور سلاطینِ مغلیہ)

ملکہ ارجمند بانو (ممتاز محل)

شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ (۱۰۳۸ھ ۱۶۲۸ء تا ۱۰۶۹ھ ۱۶۵۸ء) کی چہیتی ملکہ تھی۔ والد کا نام یمین الدولہ ابوالحسن آصف خان تھا جو آصف جاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ ملکہ نورجہان کا حقیقی بھائی تھا اور عہدِ جہانگیری میں بڑے جاہ و اقتدار کا مالک تھا۔ ارجمند بانو کی والدہ مرزا غیاث الدین علی قزوینی کی بیٹی تھی جو عہدِ اکبری میں فوج کا میر بخشی تھا۔

ارجمند بانو ۱۴ رجب ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۳ء کو پیدا ہوئی۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ جہانگیر بادشاہ کو اس کی سلیقہ شعاری، علم و دانش، ادب و تمیز اور حسنِ صورت کا علم ہوا تو اس نے اسے نوجوان شہزادے خرم (شاہجہان) کے لیے مانگ لیا۔ ۱۰۲۱ھ ۱۶۱۲ء میں شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ رسومِ شادی اعتماد الدولہ کے عظیم الشان محل میں ادا کی گئیں۔ جہانگیر بادشاہ بہ نفسِ نفیس رونق افروز ہوا۔ دولھا نے اپنے ہاتھ سے ہیروں کا ہار دلہن کے سر سے باندھا۔ پانچ لاکھ کا مہر قرار پایا۔

ارجمند بانو کے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی وجہ سے شاہجہان اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ، سخن فہم اور سخن سنج خاتون تھی اور شاہجہان کے مزاج پر پوری طرح حاوی تھی۔ سفر ہو یا حضر وہ بالعموم اس کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۰۳۸ھ ۱۶۲۸ء میں وہ تخت نشین ہوا تو تاج پوشی کے موقع پر ارجمند بانو کو ممتاز محل کا لقب دیا اور ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی۔ دونوں میاں بیوی کی مثالی محبت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ شاہجہان اس کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کو ہمیشہ رعایا کے حق میں مفید ثابت کرتی رہی۔ اس نے بہت سے لوگوں

کی جان بخشی کرائی، اور بے شمار قیدیوں کی سزائیں تخفیف کرائی۔ یہ سب کچھ اس نے ازراہِ ترحم کیا اور بادشاہ سے درخواست کر کے احکام حاصل کیے ورنہ وہ گھریلو قسم کی خاتون تھی، اور امورِ سلطنت میں دخل دینا پسند نہ کرتی تھی۔ اپنے شوہر کا بے حد خیال رکھتی تھی، اور اس کی خدمت کو اپنے لیے بڑی سعادت جانتی تھی۔ اس کو شاہی خزانہ سے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد کرنے میں صرف کر دیتی تھی۔

۱۰۴۰ھ/۱۶۳۱ء میں شاہجہان دکن گیا تو ممتاز محل کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ برہان پور کے مقام پر ممتاز محل کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کی ولادت کے فوراً بعد، ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ/۱۷ جون ۱۶۳۱ء کو وہ راہی ملکِ عدم ہو گئی۔ شاہجہان کو اس کی موت کا نہایت صدمہ ہوا اور اس کے بعد اس نے کوئی اور نکاح نہ کیا۔ ممتاز محل کا جسدِ خاکی کچھ مدت بعد برہان پور سے آگرہ لا کر اس عظیم الشان مقبرے میں دفن کیا گیا جو "تاج محل" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے بلکہ صنعتِ تعمیر اور فن کاری کے بعض پہلوؤں سے دنیا بھر میں اس حسین و جمیل عمارت کا کوئی جواب نہیں۔ یہ شاہجہان اور ممتاز محل کی مثالی محبت کی لافانی یادگار ہے۔

ممتاز محل سے شاہجہان کے چودہ بچے ہوئے جن میں سے نصف زندہ رہے۔ تین شہزادیاں اور چار شہزادے۔ شہزادوں کے نام یہ تھے، دارا شکوہ، محمد شجاع، محمد مراد بخش، اور محمد اورنگ زیب۔ ان میں سے محمد اورنگ زیب (عالمگیر) ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک ہوا اور پچاس سال تک بڑی شان سے حکومت کی۔ شہزادیوں کے نام یہ تھے جہاں آرا بیگم، روشن آرا بیگم اور گوہر آرا بیگم۔

(بزمِ تیموریہ۔ مشاہیرِ نسواں۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ)

شہزادی جہاں آرا بیگم

شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ) اور ارجمند بانو (ممتاز محل) کی پہلوٹھی کی بیٹی تھی۔ ۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ (مطابق ۲ اپریل ۱۶۱۴ء) کو پیدا ہوئی۔ بیگم صاحب، بادشاہ بیگم اور فاطمۃ الزمان القاب تھے۔ اس کی تعلیم تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ چنانچہ وہ نہ صرف جملہ علوم دینی میں طاق ہو گئی بلکہ ذوقِ شعروادب کے اعتبار سے بھی بہت بلند مقام حاصل کیا۔ نہایت فیاض، معارف پرور اور علماء و شعراء کی قدر دان تھی۔ اگرچہ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی لیکن روزمرہ کی زندگی میں احکامِ شریعت کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کے دستِ کرم سے بے شمار غربا اور حاجت مند وظیفہ پاتے تھے۔ عبادتِ الٰہی اور خلقِ خدا کی خدمت کے سوا اسے اور کوئی شوق نہ تھا۔ جہاں آرا بیگم کی لیاقت اور گوناگوں صلاحیتوں کی بناء پر شاہجہاں اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ اس نے اپنی چہیتی بیٹی کا چھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ یہ نصف نقد اور نصف جاگیر کی صورت میں تھا جو بادشاہ نے اسے عطا کر رکھی تھی۔

شاہجہاں نے جہاں آرا بیگم کا محل اپنے محل کے بالکل قریب ہی بنوایا تھا۔ جب تک اسے روزانہ دیکھ نہ لیتا چین نہ پڑتا تھا۔ شاہجہاں کو تخت نشین ہوئے ابھی چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء میں اس کی چہیتی بیگم ارجمند بانو (ممتاز محل) فوت ہو گئی۔ اب بادشاہ نے شاہی محل کا سارا انتظام جہاں آرا کے سپرد کر دیا۔ شہزادی کو بھی اپنے شفیق باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ تمام کھانے اپنی نگرانی میں تیار کرواتی اور جب تک خود چکھ کر دیکھ نہ لیتی انہیں

بادشاہ کے دسترخوان پر نہیں چُنا جاتا تھا۔

جہاں آرا بہت باحیا اور پردے کی پابند تھی۔ ایک دفعہ وہ رات کو بادشاہ سے رخصت ہو کر اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی کہ اس کا دامن کافوری شمع سے الجھ گیا اور اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ شہزادی نے اس شرم سے کہ دوسرے لوگ آکر کہیں اس کے جسم کا کوئی حصہ نہ دیکھ لیں شوروغل نہ کیا۔ اتفاق سے چار لونڈیوں نے جو کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے آرہی تھیں اس کو آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا دیکھ لیا۔ انہوں نے دوڑ کر آگ بجھانے کی کوشش کی۔ آگ بجھاتے بجھاتے بھی شہزادی کے ہاتھ اور بازو جل گئے اور دو لونڈیاں بھی بُری طرح جھلس گئیں۔ اس صدمہ سے شہزادی کو غش آگیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا۔ اس نے دُور دُور سے ماہرِ فن جرّاح اور طبیب طلب کیے اور اُن کو شہزادی کے علاج پر مامور کیا۔ ساتھ ہی ہر روز ہزاروں روپے اللہ کی راہ میں لٹانے شروع کر دیے تاکہ غربا اور مساکین شہزادی کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ اس نے چار ماہ تک سلطنت کا کام کاج نہیں کیا، ہر وقت مصلّے پر بیٹھ کر شہزادی کی صحت یابی کی دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ اس دوران میں شہزادی کے بھائیوں نے بھی اپنی پیاری بہن کی خبر گیری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آخر عارف نامی ایک جراح کے علاج سے شہزادی کو شفا ہو گئی۔ بادشاہ نے عارف کو سونے میں تولا اور یہ سارا سونا اسے عطا کر دیا۔ اس کے علاوہ بیش قیمت خلعت اور ہاتھی گھوڑے بھی اس کو انعام میں دیئے۔ شہزادی سلام کے لیے والد کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے بے شمار قیمتی جواہر، لعل اور یاقوت اس پر نچھاور کیے۔ شاہجہاں نے منت مانی تھی کہ شہزادی کے صحت یاب ہونے پر پانچ لاکھ روپیہ راہِ خدا میں تقسیم کروں گا۔ چنانچہ اس میں سے اس نے ایک لاکھ روپیہ مکہ معظمہ اور پچاس ہزار روپیہ مدینہ منورہ بھیجا۔ باقی رقم مختلف مقامات پر غریبوں، یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شہزادی نے تندرست ہونے پر اجمیر شریف جانے کی منت مانی تھی۔ چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف روانہ ہوئی۔ طویل سفر کی وجہ سے اس کے زخم پھر ہرے ہوگئے اور نئے سرے سے علاج شروع ہوا۔ اب کی بار ہامون نامی ایک درویش کے مرہم سے اس کو مکمل شفا نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے ہامون کو انعام میں کئی گاؤں بطور جاگیر دیئے۔ پھر اس نے ایک عام جشن برپا کیا جس میں لاکھوں روپے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کیے۔

۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ء میں جہاں آرا بیگم نے قلعہ آگرہ کے صدر دروازہ کے متصل ایک عالی شان جامع مسجد بنوانی شروع کی۔ اس کی تعمیر پر پانچ لاکھ روپیہ صرف ہوا اور یہ ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے ساتھ شہزادی نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو بہت عرصہ تک نہایت کامیابی سے چلتا رہا۔ اب بھی یہ کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔ مسجد کے گرداگرد دکانوں کی آمدنی مسجد اور مدرسہ کے لیے وقف ہے۔

اس جامع مسجد کے علاوہ شہزادی نے مزار خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ اجمیری کے نقرئی محجر اور بیگمی دالان، کشمیر میں ملا شاہ بدخشیؒ کی مسجد اور دلی میں ایک بہت بڑی سرائے کی عمارتیں بھی بنوائیں۔ اس نے صرف یہ عمارتیں ہی نہیں بنوائیں بلکہ مختلف مقامات پر چند وسیع و عریض احاطوں میں باغات بھی لگوائے مگر اب ان کے کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس کا احداث کرایا ہوا ایک بہت بڑا باغ لاہور میں بھی تھا، اب اس باغ کی صرف بلند و بالا منقش ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے جسے "چوبرجی" کہا جاتا ہے۔ یہ ڈیوڑھی دراصل باغ کا بڑا دروازہ ہے۔ اس دروازے کی پیشانی پر مشرق کی جانب نیلے حروف میں بخطِ جلی آیۃ الکرسی منقوش تھی۔ جس کے آخر میں اس باغ اور عمارت کا سنہ تعمیر ۱۰۵۶ھ درج تھا۔ اس کے علاوہ یہ دو شعر بھی درج تھے:

بفضلِ قادر و قیوم و خالق دوراں ‌ ‌ ‌ ‌ بنا پذیر شد ایں باغ روضۂ رضواں

بگشت مرحمت ایں باغ بر میا بائی　　ز لطف صاحب زیبندہ بیگم دوراں

میا بائی شہزادی جہاں آرا بیگم کی کنیز یا کھلائی تھی۔ شہزادی نے یہ باغ اسے بخش دیا تھا۔ ڈیوڑھی کے مغربی دروازے پر یہ شعر منقوش تھا:

ساخت میا بائی فخر نساء

روضۂ عالی ارم احتشام

افسوس کہ امتدادِ زمانہ سے ان عمارتوں کے بہت کم حصے اب باقی رہ گئے ہیں۔

اسی سال (۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء) میں شاہجہاں اور شہزادہ اورنگ زیب کی آمد لاہور میں ہوئی۔ شہزادے نے یہ باغ دیکھا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے لاہور سے ایک خط جہاں آرا بیگم کو بھیجا جس میں اس باغ کا ذکر ان الفاظ میں کیا:-

"لحظہ سیر باغ سرکار عالیہ نشاط افزائے خاطر مشتاق گشت داز مشاہدۂ تالاب و عمارات کہ بتازگی اساس یافتہ بہجت فراواں اندوخت۔ نہایت جائے تفریح دلکشاست اگر عمارت فراست خاں را بطرف ساختہ در آنجا بقرینہ ایوانے کہ در برابر آں مرتب شود نشیمنے ترتیب یا بد و بعض تصرفات مناسب بعمل آید سیر گاہ بے نظیر میشود۔" (رقعاتِ عالمگیری ص ۱۴۵)

یعنی ہم نے کچھ دیر سرکارِ عالیہ کے باغ کی سیر کی جس سے طبیعت کو بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ تالاب اور عمارات جو تازہ تازہ بنی ہیں ان کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی یہ جگہ بہت اچھی تفریح گاہ ہے اگر فراست خاں کی عمارت کو گرا کر محل کے انداز پر قرینے سے ایک نشیمن بنا لیا جائے اور عمارت میں کچھ اور رد و بدل کر دیا جائے تو یہ ایک بے نظیر سیر گاہ بن سکتی ہے۔

اس خط میں اورنگ زیب نے جس تالاب اور جن عمارات کا ذکر کیا ہے اب ان میں سے کوئی باقی نہیں ہے۔ صرف یہ ڈیوڑھی قائم ہے۔

جہاں آرا بیگم کی علم دوستی، سخن فہمی اور علماء و شعراء نوازی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ اس کو صوفیۂ کرام سے بے حد عقیدت تھی، ابتدا

میں وہ حضرت ملا شاہ قادریؒ[1] کی مرید تھی۔ بعد میں سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کرلی۔ وہ وقتاً فوقتاً حصولِ برکت و دعا کے لیے اپنے دَور کے اہل اللہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتی رہتی تھی۔ شہزادی نے دو کتابیں بھی تصنیف کیں۔ "مونس الارواح" اور "صاحبیہ"۔ اوّل الذکر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور ان کے اکابر خلفاء کے سوانح حیات ہیں اور ثانی الذکر میں حضرت ملا شاہ قادریؒ کے نامکمل سوانح حیات ہیں۔ اس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی خوش عقیدہ خاتون تھی اور اپنے والد کی طرح اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضر ہونے اور ان پر چادریں چڑھانے کو کارِ ثواب سمجھتی تھی۔

---

[1] حضرت ملا شاہ قادری بدخشیؒ کا شمار گیارہویں صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ اصل نام شاہ محمدؒ اور لقب لسان اللہ تھا۔ موضع ارکساء (علاقہ رودستاق ولایت بدخشاں) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ملا عبدی تھا جو ارکساء کے قاضی تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ارکساء میں ہوئی۔ دینی علوم حاصل کرنے میں انہوں نے سخت محنت کی۔ عنفوانِ شباب میں وطن سے کشمیر آئے۔ تین سال بعد آگرہ گئے اور ۱۰۲۲ھ میں آگرہ سے لاہور آکر حضرت میاں میرؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئے اور تیس سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ مرشدِ گرامی نے راہِ سلوک کی منزلیں طے کرا کے کندن بنا دیا۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ بہت کم کھاتے تھے، بہت کم بولتے تھے اور بہت کم آرام کرتے تھے۔ سرد ملک کے رہنے والے تھے گرمیوں میں مرشد کی اجازت سے کشمیر چلے جاتے تھے۔ داراشکوہ ان کا نہایت عقیدت مند تھا۔ اس نے اپنی کتاب "سکینۃ الاولیاء" میں ان کی کئی کراماتوں کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ملا شاہؒ فقر و استغنا، قناعت و توکل، تسلیم و رضا، عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم ہونے کے علاوہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ شاہ تخلص کرتے تھے۔ ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء میں وفات پائی۔ آخری آرامگاہ موضع میاں میر (لاہور) میں ہے۔ انہوں نے جو تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: دیوان اوّل۔ دیوان دوم۔ شرح رباعیات۔ قصائد عربی۔ رسالہ حمد و نعت و منقبت۔ یوسف زلیخا۔ رسالہ بسم اللہ۔ رسالہ شاہیہ۔ رسالہ مرشد۔ تفسیرِ شاہ (سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران اور سورۂ یوسف کی تفسیر)۔

(تذکرہ اولیائے پاک و ہند: "نقوش" لاہور نمبر)

۱۰۵۳ھ میں شاہجہاں کے ساتھ اجمیر گئی اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضر ہوئی۔ اس سفر کے تاثرات اس نے اس طرح قلمبند کیے ہیں:

"۱۸ شعبان المبارک ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳) کو والدِ بزرگوار کے ساتھ اکبر آباد سے اجمیر روانہ ہوئی اور ۷ رمضان المبارک کو اجمیر پہنچی۔ راستہ بھر یہ معمول رکھا کہ ہر منزل پر دو رکعت نماز نفل ادا کرتی۔ پھر سورۂ یٰسین اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر حضرت خواجہ معین الدین رضی اللہ عنہ کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچاتی۔ اجمیر میں تال انا ساگر کے کنارے قیام تھا۔ ادب کے خیال سے رات کو پلنگ پر نہ سوئی۔ روضۂ مقدس کی طرف نہ پاؤں پھیلائے اور نہ پشت کی۔ دن کو درختوں کے نیچے رہتی —— سات دن گزار کر ۱۴ رمضان المبارک کو مزارِ اقدس کی زیارت سے سرفراز ہوئی۔ پلکوں سے مزار کے اردگرد جھاڑو دی، خاکِ مزار کو چہرے پر ملا۔ اس وقت ایسا ذوق و شوق طاری ہوا کہ احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ بہرحال مزارِ اقدس پر عطر ملا اور پھولوں کی چادر چڑھائی جو سر پر اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس کے بعد سنگِ مرمر کی مسجد میں جو آبا حضرت نے بنوائی ہے دوگانۂ شکر پڑھا۔ پھر گنبد مبارک میں بیٹھ کر سورۂ فاتحہ اور سورۂ یٰسین پڑھی اور مغرب کی نماز تک وہیں قیام کیا۔ شمع روشن کی جھالرے کے پانی سے روزہ افطار کیا اور با دلِ بریاں و چشمِ گریاں رخصت ہوئی۔ اگرچہ اس مقدس مقام سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تمام رات بیقراری میں گزاری۔ صبح اکبر آباد کی طرف کوچ کیا۔"
(مونس الارواح)

اس تحریر سے جہاں آرا بیگم کے رجحانِ طبع کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"صاحبیہ" کے آخر میں اپنی خود نوشت سرگزشت میں وہ لکھتی ہے کہ:

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے مجھ سے کوئی فرض نماز قضا نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ نفلی روزے رکھتی رہی تاکہ جوانی کا جوش اور نفسانی

خواہشات مرتی رہیں۔"

شہزادی عمر بھر اپنے والد کی نہایت فرماں بردار اور اطاعت گزار رہی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں جب اورنگ زیب نے داراشکوہ کو شکست دے کر شاہجہاں کو نظر بند کر دیا اور خود تاج و تخت سنبھال لیا تو جہاں آرا بیگم نے اس وقت بھی باپ کا ساتھ نہ چھوڑا اور جب تک وہ جیا برابر تن دہی کے ساتھ اس کی خدمت کرتی رہی۔ شاہجہاں کی نظر بندی کے زمانے میں وہ اس کے اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتی تھی اور تمام خط و کتابت اسی کے ذریعے ہوتی تھی داراشکوہ سے بے حد الفت کی بناء پر وہ کچھ عرصہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی مورد عتاب بھی رہی لیکن بعد میں یہ کشیدگی دور ہو گئی اور عالمگیرؒ نے نہ صرف اس کے وظیفے کی رقم دگنی کر دی بلکہ اعزاز و احترام میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آٹھ سال کی نظر بندی کے بعد شاہجہاں نے قلعۂ آگرہ میں انتقال کیا تو جہاں آرا بیگم نے اس کے کفن دفن کا تمام بندوبست خود کیا۔ عالمگیرؒ تعزیت کے لیے خود اس کے محل میں حاضر ہوا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم ایک خوش گو شاعرہ بھی تھی۔ اس نے اپنے والد (شاہجہاں) کی وفات پر ایک دردناک مرثیہ کہا جس کے تین شعر یہ ہیں:-

اے آفتابِ من کہ شدی غائب از نظر
آیا شبِ فراق ترا ہم بود سحر

اے بادشاہِ عالم و اے قبلۂ جہاں
بکشائے چشمِ رحمت و برحالِ من نگر

نالم چنیں زغصہ و بادم بود بدست
سوزم چو شمع و رغم و دودم رود زسر

اپنی تصنیف "مونس الارواح" میں وہ حضرت معین الدین اجمیریؒ کے حالات کی ابتداء اپنے ان اشعار سے کرتی ہے:

آں شہنشاہِ جہانِ معرفت | ذاتِ او بیروں ز ادراکِ وصفت

خسرِ ملکِ فنا بے تخت و تاج | از خود و از غیرِ خود بے احتیاج
غرقِ بحرِ عشق از صدق و صفا | از خودی بیگانہ با حق آشنا

یاد رہے کہ یہ کتاب شہزادی نے ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں لکھی تھی اس وقت اس کی عمر صرف بائیس برس کی تھی۔
جہاں آرا بیگم نے ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) میں وفات پائی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے احاطے میں اپنے لیے ایک سادہ سا مقبرہ بنوا لیا تھا چنانچہ اسی میں سپردِ خاک کی گئی۔ اس کی لحد پر یہ شعر کندہ ہے جو خود اسی کا بیان کیا جاتا ہے ؎

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزارِ مرا | کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

اورنگ زیب عالمگیرؒ اس کی وفات کے وقت دکن میں تھا۔ اسے جب بہن کی رحلت کی خبر ملی تو بے اختیار رو پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں آرا بیگم نے تین کروڑ روپے کی جائداد چھوڑی۔ اس کی وصیت کے مطابق یہ تمام دولت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے خدام میں تقسیم کر دی گئی۔ (مشاہیر نسواں۔ ناموران عالم۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ وغیرہ)

ترکان خاتون تالی رابعہؒ

سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) کے انیسویں فرمانروا سلطان ابراہیم (۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) تا ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء)) کی ملکہ اور بیسویں فرمانروا سلطان محمد چہارم (۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) تا ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷ء)) کی والدہ تھی۔ نہایت عالی حوصلہ سخی اور عبادت گزار خاتون تھی۔ کثرتِ عبادت کی وجہ سے وہ "تالی رابعہ" (رابعہ ثانی) کے لقب سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس نے ایک عظیم الشان جامع مسجد استنبول میں بنوائی اور اس کے لیے وقف مقرر کیا۔ ایک اور جامع مسجد جس کو ترکان خاتون کی ساس ملکہ ماہ پیکر نے بنوانا شروع کیا تھا، اس کی تعمیر پایۂ تکمیل تک پہنچائی۔ علاوہ ازیں رفاہِ عام کے بے شمار کام کیے جن میں کئی نہریں، مدرسوں اور شفاخانوں کی تعمیر بھی شامل ہے۔ اس طرح خدمتِ خلق کے ذریعے اس نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اس نیک ملکہ نے ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) میں وفات پائی۔

(سی ڈبلیو ولسن وغیرہ)

شہزادی روشن آرا بیگم

شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ کی صاحبزادی تھی۔ ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۶ھ ۱۶۱۷ء کو ملکہ ارجمند بانو (ممتاز محل) کے بطن سے پیدا ہوئی۔ جہاں آرا بیگم اس کی حقیقی بڑی بہن تھی۔ جہاں آرا بیگم کی طرح اس کی تعلیم و تربیت بھی بڑے اہتمام سے ہوئی۔ چنانچہ وہ جملہ علوم و فنون اور تدبیر و سیاست میں یکتائے روزگار ہو گئی۔ فن کتابت میں تو وہ اپنا جواب آپ تھی۔ اس کا خط اتنا پاکیزہ تھا کہ اسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ اس نے بھی جہاں آرا بیگم کی طرح ساری عمر شادی نہیں کی۔ والد کی طرف سے اس کو ایک بڑی جاگیر ملی ہوئی تھی اور معقول وظیفہ بھی ملتا تھا۔ وہ اپنی دولت کا بیشتر حصہ غریبوں مسکینوں اور محتاجوں پر صرف کر دیتی تھی۔

روشن آرا بیگم بہت دیندار اور صحیح العقیدہ خاتون تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس کو سب بھائیوں میں اورنگ زیب (عالمگیرؒ) سے زیادہ محبت تھی اور وہ اس کی دل و جان سے ہوا خواہ تھی۔ جب اس کے بھائیوں (داراشکوہ، مراد، شجاع اور اورنگ زیب) کے درمیان تخت نشینی کا جھگڑا پیدا ہوا تو اس نے ہر موقع پر اورنگ زیب کا ساتھ دیا۔ شاہجہاں کے دربار میں اورنگ زیب کے خلاف جو سازشیں ہوتی تھیں وہ ان سے اورنگ زیب کو آگاہ کر دیا کرتی تھی۔ معرکۂ ساموگڈھ کے بعد اورنگ زیبؒ نے شاہجہاں کو معزول کر کے قلعہ آگرہ میں نظر بند کیا تو باپ نے بیٹے کو ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ اس موقع پر قلعے کے اندر داراشکوہ کے حامیوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ جب اورنگ زیب قلعے کے اندر داخل ہو تو چند مسلح عورتیں اس پر حملہ کر کے گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں۔ شہزادی روشن آرا بیگم

نے اس منصوبے سے اورنگ زیب کو آگاہ کر دیا اور وہ اس جال میں پھنسنے سے بچ گیا۔ اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ روشن آرا بیگم کی مخلصانہ خیر خواہی اور بیدار مغزی نے اورنگ زیب کو بہت فائدہ پہنچایا اور وہ اپنے مخالفین کے عزائم کو ناکام بنا کر تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بلاشبہ یہ کامیابی اس کی اپنی تدبیر و سیاست اور عزم و ہمت کی بھی مرہونِ منت تھی، مگر اس سلسلے میں روشن آرا بیگم کی مساعی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اس کو بے حد عزیز رکھتا تھا۔

شہزادی روشن آرا بیگم نے رفاہِ عامہ کے سلسلے میں بھی بہت سے کام کیے لیکن اب ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، البتہ دلّی میں اس کا لگوایا ہوا ایک باغ مدت تک باقی رہا۔ شاید یہ اب بھی وہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہو۔

(مشاہیر نسواں وغیرہ)

ملکہ اعزّ النّساء بیگم

شہاب الدین محمّد شاہجہان فرمانروائے ہند کی ملکہ تھی۔ وہ بالعموم "اکبر آبادی محل" کے لقب سے مشہور رہے۔ بڑی دین دار، باخدا اور مخیّر خاتون تھی۔ دلّی کی اکبر آبادی مسجد اس نے ڈیڑھ لاکھ روپے (آج کل کے دو تین کروڑ روپے) کی لاگت سے تعمیر کرائی۔ پھر اس مسجد کے لیے وقف معیّن کیے اور حکم دیا کہ وقف جائداد کی آمدنی مسجد و حمام کی مرمت اور علماء و طلبا کے وظائف پر خرچ کی جائے۔ دلّی کے فیض بازار میں مسجد اکبر آبادی آج تک اس نیک خاتون کی یاد دلاتی ہے۔ (مشاہیر نسواں)

ستی النساء

بعض تذکروں میں اس کا نام سیدۃ النساء بیگم، بعض میں ستی خانم اور بعض میں ستی النساء خانم درج ہے۔ ملک الشعراء طالب آملی[1] کی بہن تھی۔ قرآنِ مجید کی حافظہ اور بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھی۔ علمِ طب، علمِ قرأت اور فارسی ادب میں اس کو خاص دسترس تھی۔ علمِ طب اس نے اپنے شوہر نصیرائی کاشی (برادر حکیم رکنائی کاشی) سے حاصل کیا تھا جو ایک مستند حاذق طبیب تھا۔ اس سے پہلے اس نے امراضِ نسواں کے علاج کی باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی۔ رسوم خانہ داری میں بھی طاق تھی اور ادب و تمیز کے لحاظ سے بھی منفرد مقام رکھتی تھی۔ اس کا وطن آمل (مازندران کا ایک شہر تھا) جہانگیر کے عہد میں طالب آملی کو ملنے ہندوستان آئی اور یہیں رہ پڑی۔
ستی النساء کو اپنے بھائی طالب آملی سے بہت محبت تھی۔ جب اس نے ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء میں وفات پائی تو اپنے پیچھے دو بیٹیاں چھوڑیں۔ ستی النسا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کی پرورش اور تربیت اپنے ذمے لی۔ اس کے اپنے

---

[1] طالب آملی کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے نامور فارسی شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ آمل (مازندران - ایران) کا رہنے والا تھا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر ہی میں ہندسہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، تصوف اور خوشنویسی میں درجۂ کمال کی دسترس حاصل کر لی تھی۔ وہ ابتدائے عمر ہی میں مازندران سے کاشان آ گیا تھا۔ اس نے یہیں شادی کی اور یہیں مشقِ سخن کا آغاز بھی کیا۔ پھر مرو جا کر وہاں کے حاکم ملکش خان کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں سے تلاشِ معاش میں ہندوستان آیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان سے جانی بیگ ترخان والیٔ قندھار کے پاس چلا گیا۔ سنہ ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں اس کی وفات کے بعد دوبارہ ہندوستان

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان لڑکیوں ہی کو اپنی بیٹیاں بنالیا۔ ستی النساء کے شوہر نے وفات پائی تو اس کو ملکہ ممتاز محل کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ اپنے اخلاق، شائستگی، حسنِ گفتگو، ادب و تمیز اور فنِ طب میں مہارت کی وجہ سے بہت جلد ملکہ کی منظورِ نظر بن گئی اور اس نے اُس کو اپنی "مُہر دارِ خاص" مقرر کر دیا۔ شاہی حرم میں یہ ایک بہت اونچا اور معزز عہدہ تھا۔ اس کی قابلیت اور علمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے شاہجہاں بادشاہ نے اس کو اپنی چہیتی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم کی اتالیق بنا دیا۔ اس نے شہزادی کو بڑی محنت اور توجہ سے تعلیم دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادی بہت جلد قرآنِ پاک اور فارسی ادب کی تعلیم سے فارغ ہو گئی۔

ستی النساء شاہی خیرات خانہ کی بھی منتظم تھی۔ وہ ہمیشہ غریب اور محتاج عورتوں کی تلاش میں رہتی تھی کہ ان کی مدد کر سکے۔ اسی طرح وہ قابلِ شادی غیر مستطیع

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

آیا اور بعض امراء کے توسط سے اعتماد الدولہ خواجہ غیاث الدین بیگ محمد رازی (والدِ نور جہاں) کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ وہاں اس کی شاعری نے خوب بال و پر نکالے اور اعتماد الدولہ نے اس کو جہانگیر کے دربار میں پہنچا دیا۔ جہانگیر نے اس کو ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعراء بنا دیا۔ بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق ملک الشعراء کا خطاب اسے شاہجہان کے زمانے میں ملا لیکن یہ صحیح نہیں۔ طالبؔ آملی نے بحالتِ دیوانگی جہانگیر کے عہدِ حکومت کے آخر میں ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس نے بہت سی غزلیات، قصائد، قطعات، ترکیب بند اور مثنویاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ اس کے دیوان کے قلمی نسخے دنیا کے کئی اہم کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے طالبؔ آملی کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ آزاد بلگرامی نے اسے "شاعرِ خوش تخیل و جویائے معانی بلند و غواصِ لآلی دلپسند" قرار دیا ہے۔ طالبؔ نے اپنی غزلیات میں معانی کی لطافت اور خیال کی رنگینی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کے قصائد اور قطعات کی زبان بہت شیریں اور لطیف ہے اور عہدِ جہانگیر کی رنگین و لطیف فضا کی ترجمان ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۲)

کنواری لڑکیوں کی ٹوہ بھی لگاتی رہتی تھی تاکہ عزت وآبرو کے ساتھ ان کی شادی کرا دے۔ اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں وہ ملکہ کی وساطت سے بادشاہ کو خبریں پہنچاتی رہتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے اس کو ایسے نیک کاموں کے لیے روزانہ دل کھول کر روپیہ دیا جاتا تھا۔ اس طرح اس کے ہاتھ سے ہر روز ہزاروں روپیہ کارہائے خیر پر صرف ہوتا رہتا تھا۔

ملکہ ممتاز محل نے سنہ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں برہان پور کے مقام پر وفات پائی۔ کچھ مدت بعد جب اس کی لاش تدفین کے لیے آگرہ لے جائی گئی تو ستی النساء بھی اس کے ساتھ گئی اور تجہیز وتکفین کے تمام مراسم اسی کے زیر نگرانی انجام دیئے گئے۔ ممتاز محل کی موت کے بعد شاہجہان نے اپنے وعدہ کے مطابق کوئی اور شادی نہیں کی اس لیے ملکہ کی تمام ذمہ داریاں جہاں آرا بیگم کے سر پر آ پڑیں اور اس کو ماں کی جگہ شاہی حرم میں صدرِ خاندان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نے بھی ستی النساء کا اعزاز واکرام برقرار رکھا اور تمام امور میں اس سے مشورہ لیتی رہتی۔ "مُہر دارِ خاص" کا عہدہ بھی بدستور ستی النساء کے پاس رہا۔ شاہی خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں کی شادی کے موقع پر وہی شاہی تحفہ جات لے کر جاتی تھی اور انہیں مناسب موقع پر پیش کرتی تھی۔ اس خدمت کے صلے میں اسے وہاں سے بھی کافی انعام واکرام ملتا تھا۔ داراشکوہ اور دوسرے شہزادوں کی شادیوں اور دوسری تقاریب پر بادشاہ اور جہاں آرا بیگم نے ستی النساء کے ذریعے لاکھوں روپے خرچ کیے۔ اس سے ایک طرف تو اس پر اعتماد کا اظہار مقصود تھا اور دوسری طرف اس کی عزت افزائی منظور تھی۔

چونکہ ستی النساء نے کئی سال تک ملکہ ممتاز محل مرحومہ کی دل وجان سے خدمت کی تھی اس لیے شاہجہان اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس نے ستی النساء کو حرم کا مہتمم خاص بنا دیا تھا اور اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا۔ شاہی خاصہ کا انتظام بھی ستی النساء کے سپرد تھا۔ وہ شاہی دسترخوان اپنے سامنے بچھواتی تھی اور جب تک بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کھانے سے فارغ نہ ہو لیتے وہ وہاں

حاضر رہتی تھی۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ستی النساء نے اپنے مرحوم بھائی طالب آملی کی دو بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں بنا لیا تھا۔ ویسے تو اس کو دونوں لڑکیوں سے محبت تھی لیکن چھوٹی لڑکی سے حد سے بڑھ کر پیار تھا۔ جب یہ لڑکیاں جوان ہوئیں تو اس نے بڑے اہتمام سے ان کی شادیاں کیں۔ چھوٹی لڑکی کی شادی اس نے اپنے شوہر کے بھتیجے حکیم ضیاء الدین سے کی جسے اس نے ایران سے خاص اسی غرض سے بلایا تھا اور اس کو دربار میں ایک اچھے عہدے پر فائز کرا دیا تھا۔ لیکن ستی النساء کی بد قسمتی کہ اس کی یہ چہیتی بھتیجی شادی کے بعد زیادہ مدت زندہ نہ رہی اور اس کو داغ مفارقت دے گئی۔ یہ واقعہ ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء کا ہے۔ پھوپھی کو اس کی وفات کا شدید صدمہ پہنچا۔ وہ گیارہ دن تک اپنے مکان میں بیٹھے کر روتی رہی۔ ان دنوں اس کا قیام لاہور میں تھا جہاں اس کی قیام گاہ قلعۂ لاہور کے باہر ایک مکان میں تھی۔ اقربا اور خیر خواہوں نے اس کی تسکین و دلدہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس کو کسی پل قرار نہ آتا تھا[1] آخر وہ تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو گئی۔ تلاوت کرتے کرتے ہی اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ شاہی حکیموں اور خود اس کے داماد کی سر توڑ کوششوں کے باوجود لمحہ بہ لمحہ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ آخر سب سے بڑے شاہی حکیم مسیح الزماں کو بلایا گیا۔

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ وفات سے پہلے ستی النساء دلی میں تھی۔ جب شاہجہان کو اس کی حالت کا علم ہوا تو وہ جہاں آرا بیگم کو ساتھ لے کر خود اس کے مکان پر گیا اور اس کو شاہی محل میں واپس لے آیا اور ہر طریقے سے اس کی دلجوئی کی لیکن جب دوسرے دن بادشاہ شکار کی غرض سے باہر گیا تو ستی النساء پھر اپنے مکان پر واپس آگئی اور تلاوت قرآن کرتے کرتے فوت ہو گئی۔ اس کی لاش پہلے امانتاً دلی میں دفن کی گئی، بعد کو جب آگرہ میں اس کا مقبرہ تیار ہو گیا تو تابوت قبر سے نکال کر آگرہ بھیج دیا گیا۔

ان سے ستی النساء کا دُور کا رشتہ بھی تھا۔ ان کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اِنّا للہِ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔ تاریخ وفات ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء ہجری ہے۔

دوسرے دن شاہجہان کو شاہی کیمپ میں ستی النساء کی وفات کی خبر ملی تو اس کو بڑا دُکھ ہوا اور اس نے حکم دیا کہ تجہیز و تکفین میں خاص اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دس ہزار روپے خرچ کیے گئے اور اسے لاہور بطور امانت دفن کر دیا گیا۔ ایک سال اور چند ماہ کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کی لاش قبر سے نکال کر آگرہ لائی گئی اور تاج محل کے مغرب میں چوک جلو خانہ کے متصل اُس مقبرہ میں دفن کی گئی جو بادشاہ نے خاص اس کے لیے تیس ہزار کی لاگت سے تیار کروایا تھا۔ بادشاہ نے اس کے اخراجات کے لیے تیس ہزار سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں بھی وقف کر دیا۔

(اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔ مشاہیر نسواں۔ "نقوش" لاہور نمبر "سہیلی" لاہور مئی ۱۹۳۲ء وغیرہ)

ملکہ اُمِّ احمد

ترکی کے دو عثمانی فرمانرواؤں سلطان مصطفیٰ ثانی (۱۱۰۶ھ / ۱۶۹۴ء تا ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء) اور احمد ثالث (۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء تا ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء) کی والدہ تھی۔ نہایت نیک سیرت، دیندار اور مخیّرہ خاتون تھی۔ اس نے مخلوقِ خدا کی خدمت اور بھلائی کے کئی کام کیے۔ ان میں سے دو عظیم الشان جامع مسجدیں آج بھی قسطنطنیہ میں اس کی یادگار باقی ہیں — اور "ینی والدہ جامع" کہلاتی ہیں۔ ملکہ اُمّ احمد نے بارھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے کے اخیر یا تیسرے عشرے کے شروع میں وفات پائی۔ اسے اس کی تعمیر کرائی ہوئی ایک جامع مسجد کے قریب دفن کیا گیا۔ (سی ڈبلیو ولسن)

مائی لاڈو

مائی لاڈو گیارھویں صدی ہجری میں ایک بہت مالدار اور پرہیزگار خاتون گزری ہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ شہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر بادشاہ) کی دایہ تھی، اور اس کو اپنا دودھ پلایا تھا لیکن ایک اور روایت کے مطابق وہ شہزادہ خرم (شاہجہاں بادشاہ) کی دایہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے اپنے وقت پر باپ (سلیم) اور بیٹے (خرم) دونوں کو دودھ پلانے کی عزت نصیب ہوئی ہو۔ بہر صورت شاہی داد و دہش نے اس کو مالا مال کر دیا۔ اس کے خاوند کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ دونوں میاں بیوی عابد شب زندہ دار تھے اور لاہور کے رہنے والے تھے۔ مائی لاڈو شیخ سلیم چشتیؒ (مرشد اکبر بادشاہ) کی مرید تھی اور فریضۂ حج بھی ادا کر چکی تھی۔ اس نے لاہور کے محلہ "زین خان" یا "گزر تلہ"[1] میں بہت سی حویلیاں بنوائیں اور باغ لگوائے۔ ان کے علاوہ ایک شاندار مسجد بنوائی جس کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ پھر اپنی جائداد کا بہت سا حصہ اس مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کر دیا۔ مسجد اور مدرسے کی تعمیر ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۱ء میں مکمل ہوئی۔ مدرسے کے پہلے صدر مدرس اس دور کے ایک نامور عالم دین مولانا عصمت اللہؒ

---

[1] یہ محلہ اس جگہ تھا جہاں اب میو ہسپتال کا وہ شعبہ تعمیر ہو گیا ہے جس میں ناک کان گلے اور ہڈیوں وغیرہ کا علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میڈیکل کالج کے ہوسٹل تالاب گراؤنڈ اور نسبت روڈ کے ارد گرد کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا۔ بعض لوگ اس محلے کو محلہ ٹبہ بھی کہہ دیتے تھے۔ مائی لاڈو کی تعمیرات کے بعد اسے محلہ دائی (مائی) لاڈو کہنے لگے۔ آج کل تو اس کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب مسجد کے سوا اس محلے کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ ہر طرف جدید طرز کی عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔

تھے۔ وہ بڑے عابد و زاہد اور متقی بزرگ تھے! ان کی کشش دُور دُور سے طلبہ کو مدرسے میں کھینچ لائی اور یہ مدرسہ تعلیم دین کا بہت بڑا مرکز بن گیا ـــــــ مائی لاڈو نے ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں وفات پائی اس کا خاوند اس سے چند ماہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ دونوں میاں بیوی مسجد کے احاطے میں بجانب شرق مدفون ہوئے۔ ان کے فرزند محمد شکور نے اس مدرسے کی سرپرستی جاری رکھی۔ چونکہ وہ بے اولاد تھا اس نے اپنی تمام جائداد مدرسے کے نام وقف کر دی۔

امتدادِ زمانہ سے مدرسہ تو اب برباد ہو چکا ہے البتہ مسجد باقی ہے اور آباد ہے۔ اس کی عمارت پختہ چونہ کی ہے اور بہت مضبوط بنی ہوئی ہے۔ تین محرابیں ہیں اور ایک عالیشان گنبد مسقف قالبوتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک کنواں اور ایک حوض بھی تھا انہیں پُر کر دیا گیا ہے۔

(لاہور عہدِ مغلیہ میں "نقوش" لاہور نمبر)

بی بی گلشن

شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء) کے عہد میں مشہور شاعرہ گزری ہے۔ صاحبِ دیوان تھی اور اپنا دیوان اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر مرتب کیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ دیوان اہلِ ہند کی جنگِ آزادی (۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۷ء) کے دوران میں ضائع ہو گیا۔ اس کے یہ چند اشعار محفوظ رہ گئے ہیں:

بے رُخصت خار نماید چمن گل مارا
نالۂ زاغ بود، نغمۂ بلبل مارا

در جہاں ہمچو چناریم کہ با دستِ تہی
ہرگز از جانہ رود دیلئے توکّل مارا

دُر شود قطرہ چو افتاد از ابرِ نیساں
رہنما سوئے ترقی ست تنزّل مارا

گلشن زِ جلوۂ تو پری خانہ گشتہ است
بوئے گل از ہوائے تو دیوانہ گشتہ است
(اختر تاباں)

شہزادی نادرہ بیگم

شہزادہ سلطان پرویز (خلف جہانگیر بادشاہ) کی بیٹی اور شہزادی داراشکوہ (خلف شاہجہاں) بادشاہ کی اہلیہ تھی۔

شہزادی نادرہ بیگم کا والد شہزادہ سلطان پرویز جہانگیر بادشاہ کے حکم سے الٰہ آباد اور دکن کی مہمات پر مامور رہا۔ جس زمانے میں اس کے بھائی شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے والد سے بغاوت کی، سلطان پرویز ہی کو اس پر قابو پانے کے لیے دکن بھیجا گیا۔ وہ رندِ بلانوش تھا۔ ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء میں بعمر ۳۵ سال دکن ہی میں فوت ہو گیا۔ لاش وہاں سے آگرہ لائی گئی اور اس کے اپنے باغ میں دفن کی گئی۔ نادرہ بیگم اس وقت کم سن تھی۔ دادا نے یتیم پوتی کے سر پر دست شفقت رکھا اور اس کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ دو سال بعد دادا بھی فوت ہو گیا اور اس کا چچا شاہجہان تخت شاہی پر بیٹھا۔ اُس نے بھی نادرہ بیگم اور اس کی والدہ کا خاص خیال رکھا۔ نادرہ بیگم کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ جوان ہوئی تو صورت اور سیرت کے اعتبار سے ہمہ صفت موصوف تھی۔ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء میں شاہجہان نے اس کی شادی اپنے بڑے (اور سب سے پیارے بیٹے) داراشکوہ سے کر دی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ منشی ذکاءاللہ دہلوی اپنی کتاب "ظفرنامہ شاہجہاں" میں لکھتے ہیں:

> "شعبان ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء میں سلطان پرویز (خلف جہانگیر) کی بیٹی سے شہزادہ داراشکوہ کا نکاح ہوا۔ بزم نشاط و چراغاں نے آرائش پائی اور آتش بازی کے عجائبات ہوئے۔ شاعروں نے تہنیت نامے لکھے اور تاریخ ہوئی "قراں کردہ سعدین بہ برج حمل"،
> اس شادی پر بہ تفصیلِ ذیل ۳۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ سرکارِ خالصہ

کا چھ لاکھ، جہاں آرا بیگم (داراشکوہ کی بہن) کا ۱۶ لاکھ روپیہ اور دلہن کی والدہ کا دس لاکھ۔" [1]

نادرہ بیگم کے بطن سے داراشکوہ کے دو بیٹے پیدا ہوئے، شہزادہ سپہر شکوہ اور شہزادہ سلیمان شکوہ۔ نادرہ بیگم کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں کئی عمارتیں بنوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ الٰہ آباد کے قریب اس نے ایک گاؤں بسایا۔ یہ گاؤں آج بھی موجود ہے اور "بیگم کی سرائے" کے نام سے مشہور ہے۔

ساموگڑھ کے معرکے میں اورنگ زیب سے شکست کھا کر داراشکوہ پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ مصیبت کے ان ایام میں نادرہ بیگم نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ وہ اس کا حوصلہ بندھاتی اور غم دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ داراشکوہ بھی بیوی کی تشفی بخش باتوں سے اپنی مصیبتوں کو ہلکا محسوس کرتا۔ اسی اثنا میں دھاندر کے زمیندار ملک جیون نے داراشکوہ کو اپنا مہمان بنا کر گرفتار کر لیا تاکہ عالمگیر بادشاہ

---

[1] مولوی نور احمد چشتی اور بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ نادرہ بیگم داراشکوہ کی بہن تھی اور بچپن ہی سے حضرت میاں میرؒ کے پاس رہا کرتی تھی۔ نو سال کی عمر میں حضرتؒ کو ظہر کی نماز کے وقت وضو کرایا کرتی تھی۔ جب گیارہ سال کی ہوئی تو ایک دن حضرتؒ نے اس سے فرمایا کہ بیٹی اب تم جوان ہو اب مجھے وضو نہ کرایا کرو۔ شہزادی کو یہ خدمت ترک کرنے پر اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رات ہی کو فوت ہو گئی اور حضرتؒ کے حکم سے ان کی قیامگاہ کے قریب ہی دفن ہوئی۔ داراشکوہ نے اس کی قبر پر ایک عالیشان بارہ دری تعمیر کرا دی ــــــ لیکن یہ روایت بالکل بے سر و پا ہے کیونکہ شاہجہاں کی کوئی بیٹی نادرہ بیگم نام کی نہیں تھی، اس لیے اس کے داراشکوہ کی بہن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے یہ نادرہ بیگم نام کی کوئی اور لڑکی ہو لیکن داراشکوہ نے اس کی قبر پر کوئی بارہ دری نہیں بنوائی۔ موجودہ بارہ دری عالمگیرؒ کی بنوائی ہوئی ہے۔

کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ اس سے کچھ پہلے نادرہ بیگم مصیبتیں سہتے سہتے بیمار ہو گئی اور بعارضۂ اسہال فوت ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ میری لاش لاہور لے جا کر حضرت میاں میرؒ کے قدموں میں دفن کی جائے۔ چنانچہ داراشکوہ نے اس کی لاش تابوت میں رکھ کر ستر آدمیوں کے ساتھ لاہور روانہ کر دی جہاں وہ درگاہ حضرت میاں میرؒ کے احاطہ میں دفن کی گئی۔ یہ ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء کا واقعہ ہے۔ اُدھر عالمگیرؒ نے علماء سے فتویٰ حاصل کر کے ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ / ۱۰ ستمبر ۱۶۵۹ء کو داراشکوہ کو قتل کرا دیا۔

داراشکوہ نے اپنے عروج کے زمانہ میں احاطۂ حضرت میاں میرؒ میں کچھ عمارتوں کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ اس کے زوال اور موت کی وجہ سے یہ تعمیر رک گئی۔ اسی زمانے میں نادرہ بیگم کی تدفین بھی احاطۂ حضرت میاں میرؒ میں ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عالمگیرؒ نے تخت نشین ہونے کے بعد ان نامکمل عمارات کی تکمیل کرائی اور نادرہ بیگم کی قبر پر موجودہ بارہ دری بنوائی۔ اس کے ساتھ ہی ایک تالاب اور پُل بھی بنوایا۔ تالاب کا تو اب نام و نشان تک مٹ چکا ہے البتہ بارہ دری اور پُل کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

(مشاہیر نسواں۔ ظفر نامہ شاہجہان۔ نقوش لاہور نمبر۔ دائرۂ معارف اسلامیہ)
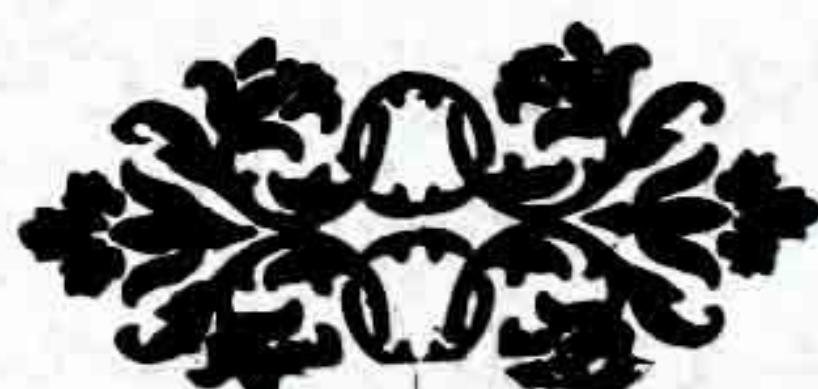
شہزادی زیب النساء

فرمانروائے ہند محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ (۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۸ھ ۱۶۵۹ء ۱۷۰۷ء) کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ عالمگیرؒ کی شہزادگی کے زمانے میں باختلافِ روایت ۱۰یا ۲۰ شوال ۱۰۴۷ھ (مطابق ۲۵ فروری یا ۷ مارچ ۱۶۳۸ء) کو دولت آباد (دکن) میں پیدا ہوئی۔ محمد صالح کنبوہ کے بیان کے مطابق اس کا نام زیب النساء اس کے دادا شاہجہاں نے رکھا۔ (عملِ صالح)

والدہ کا نام دلرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی بیگم (دختر شاہنواز خاں صفوی) تھا۔ زیب النساء کی ولادت پر دولت آباد اور دلّی کے محلاتِ شاہی میں بہت خوشیاں منائی گئیں اور بے شمار زر و جواہر غربا و مساکین میں تقسیم کیے گئے۔

زیب النساء کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ جب وہ چار سال چار ماہ اور چار دن کی ہوئی تو دیندار باپ نے اسلامی طریقہ کے مطابق اس کی بسم اللہ کرائی اور حافظہ مریمؒ کو اس کی اتالیق مقرر کیا۔ حافظہ مریمؒ (اہلیہ مرزا شکر اللہ خاں کشمیری) بڑی فاضلہ خاتون تھیں اور دینیات میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے زیب النساء کو بڑی توجہ اور محنت سے تعلیم دی۔ شہزادی بہت ذہین و فطین تھی۔ اس نے آٹھ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے سارا قرآن پاک حفظ کر لیا اور دینیات کی دوسری ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں۔ اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی تو اس کو بے حد مسرت ہوئی! اس نے اپنی ہونہار بیٹی کو تیس ہزار اشرفیاں بطور انعام دیں اور حافظہ مریمؒ کو بھی مال و دولت سے نہال کر دیا۔

اس کے بعد شہزادی نے علمُ الصّرف اور علمُ النّحو کی تحصیل ملا احمد جیون امیٹھویؒ (استاد اورنگ زیب عالمگیرؒ) سے کی اور کچھ دوسری دینی کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔

پھر شہزادی کو ملا سعید اشرف ماژندرانی کی شاگرد بنایا گیا۔ ملا موصوف اس دور کے یگانۂ روزگار عالم، ادیب، شاعر اور بہت اونچے درجے کے خوشنویس تھے۔ انہوں نے چودہ ۱۴ سال تک اس کو نہ صرف حدیث فقہ اور دوسرے ضروری علوم کی تعلیم دی بلکہ خوشنویسی بھی سکھائی اور اس میں شعر و ادب کا ذوق بھی پیدا کیا۔

مستعد خان ساقی "مآثر عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ:

"زیب النساء عربی اور فارسی کے جملہ علوم و فنون پر فاضلانہ دسترس رکھتی تھی۔ نستعلیق، نسخ اور شکستہ لکھنے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔"

کتب خانہ بھوپال (بھارت) میں زیب النساء کی لکھی ہوئی ایک نادر وصلی محفوظ ہے اس میں اس نے فن خطاطی کا پورا پورا کمال دکھایا ہے۔ اس وصلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادی نے یہ وصلی عالمگیرؒ کی خدمت میں اس وقت پیش کی تھی جب اس نے سنہ ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں مرہٹوں کے دارالحکومت ستارہ کو فتح کیا تھا۔ وصلی کے اس شعر سے فتح ستارہ کی تاریخ نکلتی ہے۔

از معجزۂ شق القمر عیاں شد

اعجاز خسروی بیں شق ستارہ آمد

فتح ستارہ

زیب النساء

تمام مورخین اور تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ شہزادی زیب النساء عربی اور فارسی میں نہایت اعلیٰ استعداد رکھتی تھی اور علم و ادب سے دلی لگاؤ رکھتی تھی۔ طبیعت نکتہ رس پائی تھی۔ شعر خوب سمجھتی تھی اور خود بھی کبھی کبھی مشق سخن کرتی تھی۔ وہ علماء اور شعراء کی بہت قدر شناس تھی اور اکثر انہیں انعام و اکرام سے نوازتی رہتی تھی۔ اپنے استادوں کے علاوہ وہ حاجی عبدالوسع بن حاجی محمد جان قدسی، عزیز اللہ خان عزیز اور مرزا خلیل کی ان کے کمالات علمی کی بناء پر خصوصیت سے سرپرستی کرتی تھی۔ اس کی خواہش پر ملا صفی الدین اردبیلی نے امام فخر الدین رازیؒ کی "تفسیر کبیر" کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "زبدۃ التفاسیر" (بروایت دیگر

"زیب التفاسیر") رکھا۔ یہ ترجمہ کئی جلدوں میں تھا۔ اب صرف ایک (پانچویں) جلد بودلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ باقی جلدوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ شہزادی نے ملّا صاحب کو اس خدمت کے صلے میں خطیر رقم عنایت کی۔ اس کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ شاہی کتب خانے کی بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر اپنا کتب خانہ بنایا جس میں نہایت نادر اور نایاب کتابیں جمع کیں۔ مستعد خان ساقی "مآثر عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ:

"اس زمانہ میں کسی کا کتب خانہ شہزادی زیب النساء کے کتب خانے سے بڑا نہ تھا۔"

شہزادی کی معارف پروری کے بارے میں غلام علی آزاد بلگرامی "ید بیضا" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس نے اپنی ہمت کو ارباب فضل و کمال کی ترقی میں مصروف رکھا۔ شاعروں، منشیوں اور خوشنویسوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی قدردانی کے سائے میں پرورش پاکر آسودگی سے زندگی بسر کرتی تھی۔ بہت سی کتابیں اس کے نام پر تصنیف و تالیف ہوئیں۔"

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے ایک مقالے میں زیب النساء کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"فارسی زبان دانی میں کمال رکھتی تھی۔ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی۔ خود صاحب تصنیف گزری ہے لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں۔ مجمع الغرائب میں ملا سعید اشرف مازندرانی نے لکھا ہے کہ زیب النساء کی ایک بیاض ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی، اس پر انہوں (ملا سعید اشرف) نے ایک قطعہ لکھ کر شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ کا وہ شعر جس میں ارادت فہم کا نام آیا ہے، یہ ہے

دوش از دستِ ارادت فہم غافل دربہن　　چوں بیاض سینۂ ماہی در آب افتادہ است

اس کے علاوہ تذکروں میں شہزادی کی ایک اور تصنیف "زیب المنشآت" کا ذکر ملتا ہے۔ تذکرۃ الغرایب کے مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے اس کو دیکھا ہے۔ زیب المنشآت شاہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے"........ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعرہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا۔"

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء نے نمونہ ہائے خطی کا ایک مجموعہ اور مرقع تصاویر بھی مرتب کیا تھا۔ زیب النساء کی طرف ایک دیوان بھی جو "دیوانِ مخفی" کے نام سے چھپا ہے منسوب کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ زیب النساء کا تخلص مخفی تھا اور نہ اس کا یہ دیوان ہے۔ اس دیوان کا مصنف مخفی تخلص کا ایک خراسانی شاعر ہے جو ہندوستان بھی آیا تھا۔ بقولے بعض وہ شہزادی زیب النساء کی ملازمت میں بھی رہا۔ یہ ثابت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ دیوانِ مخفی کو زیب النساء سے دُور کی نسبت بھی نہیں کیونکہ اس دیوان کے مندرجات خود اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ یہ کسی تہی دست مَرد شاعر کا کلام ہے جس میں اس نے کہیں اپنی پریشان حالی اور افلاس و غربت کا رونا رویا ہے کہیں دوریٔ وطن کا شکوہ اور حاسدوں کی کارستانیوں کا ذکر کیا ہے اور کہیں صلہ کا تقاضا کیا ہے۔

بعض تذکروں میں بہت سی رباعیاں، غزلیں اور متفرق اشعار زیب النساء سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی نسبت زیب النساء سے صحیح ہے۔ ان میں سے کچھ اشعار یہ ہیں :۔

آہستہ برگ گل بہ فشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

اے آبشار نوحہ گر از بہر چیستی   چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی[1]

---

[1] بعض تذکروں میں یہ مصرع اس طرح درج ہے۔ چیں بر جبیں فگندہ ہم از بہر کیستی۔

آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب   سر را بسنگ می زنی دمی گریستی[1]

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت
غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

دخترِ شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام   زیب و زینت بس ہمیں نامِ من زیب النساست

رمضان ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب عالمگیرؒ نے تخت و تاج کے دوسرے تمام دعویداروں کو مغلوب کر کے تاجِ شاہی سر پر رکھا تو زیب النساء نے اس موقع پر اس کی خدمت میں ایک بیش بہا نذر پیش کی جسے بادشاہ نے قبول کر لیا اور شہزادی کو چار لاکھ روپے کا انعام مرحمت فرمایا۔ اس سے اگلے سال جشنِ تخت نشینی کے موقع پر شہزادی نے پھر نذر پیش کی۔ بادشاہ نے اسے بھی قبول فرما لیا اور شہزادی کو بہت سا زر و جواہر عطا کیا۔

۱۰۷۴ھ/۱۶۶۴ء میں عالمگیرؒ کشمیر گیا، شہزادی زیب النساء بھی اس کے ہمراہ تھی۔ جب شاہی قافلہ چشمہ بیگم آباد (اچھابل) پہنچا جو زیب النساء کی جاگیر میں تھا تو شہزادی نے باپ کو کھانے کی دعوت دی۔ بادشاہ نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دعوت کے بعد شہزادی نے بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی اور ایک بڑی بھاری رقم اس پر نچھاور کر کے عرض کی کہ بادشاہ یہاں چند یوم قیام

---

[1] بعض تذکروں میں یہ شعر اس طرح درج ہے:

وردت چہ درد بود کہ چوں من تمام شب   سر را بہ سنگ می زدی دمی گریستی

فرمائیں۔ بادشاہ نے اس کی درخواست خندہ پیشانی سے منظور کرلی اور چند روز وہاں قیام فرمایا۔ اس کے بعد شہزادی کا قیام بالعموم دلی یا لاہور میں رہا۔

زیب النساء عام طور پر علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف رہتی تھی اور ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہتی تھی لیکن ایک دفعہ وہ ایک غلط فہمی کی بناء پر عتاب شاہی کی زد میں آگئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء میں اہل راجپوتانہ نے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ بادشاہ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے زیب النساء کے حقیقی بھائی شہزادہ محمد اکبر کو بھیجا۔ شہزادہ جو دھپور پہنچ کر اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے باغی راجپوتوں کے فریب میں آکر انہی سے مل گیا۔ شہزادی کے بعض حاسدوں نے بادشاہ کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ وہ شہزادہ محمدؐ اکبر کی حامی ہے۔ چنانچہ وہ شہزادی سے بدظن ہوگیا اور اسے سلیم گڈھ کے قلعے میں نظر بند کردیا، اس کے ساتھ ہی اس کا سالانہ وظیفہ (چار لاکھ روپیہ) بند کردیا اور تمام مال و متاع بھی ضبط کرلیا مگر جلد ہی تحقیق کے بعد ثابت ہوگیا کہ شہزادی بالکل بے قصور ہے۔ چنانچہ اسے باعزاز تمام رہا کردیا گیا، وظیفہ بھی بحال کردیا گیا اور تمام مال و متاع بھی واپس کردیا گیا۔

شہزادی کو اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت تھی اور وہ ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک رہتی تھی۔ ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء میں شہزادہ کام بخش کی شادی سیادت خاں صفوی کی بیٹی آرام بانو سے ہوئی۔ اس شادی کی تمام رسوم زیب النساء نے ادا کیں اور شادی بھی اسی کے محل میں ہوئی۔

۱۱۰۵ھ / ۱۶۹۳ء میں شہزادہ اعظم شاہ مرض استسقاء میں مبتلا ہوگیا۔ یہ بڑا خطرناک مرض تھا۔ اس بیماری کے دوران میں زیب النساء اپنی بہن زینت النساء کے ساتھ مل کر دن رات اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ شہزادہ محمدؐ اکبر جب اپنے باپ سے باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا تو زیب النساء اور اس کے درمیان اس زمانے میں بھی مراسلت ہوتی رہی۔ یہی امر عالمگیر کو اس سے بدظن کرنے کا باعث ہوا۔

شہزادی نے ساری عمر تجرد میں گزاری۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ سے منسوب ہوئی تھی مگر اس کے قتل کے بعد دل شکستہ ہو گئی اور عمر بھر شادی نہ کی۔ لیکن یہ محض قیاسی بات ہے۔ اس کے شادی نہ کرنے کا سبب اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ویسے وہ نہایت عفیف دیارسا خاتون تھی اور احکامِ شریعت کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے نہایت بلند مقام رکھتی تھی۔ ہمیشہ سادہ اور سفید لباس پہنتی تھی۔ زیب و زینت کا مطلق شوق نہ تھا تمام عمر سرمہ اور مسی کا استعمال نہیں کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا کوئی نماز قضا نہیں کی بلکہ نوافل اور مستحب بھی بڑے ذوق و شوق سے ادا کرتی تھی۔ اس کی فیاضی کی تو کوئی حد و نہایت نہیں تھی! اربابِ کمال کی قدر دانی اور سرپرستی کے علاوہ اس نے بے شمار غریب لڑکیوں، بیوہ عورتوں یتیم بچوں اور محتاجوں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ بنگالی اور اردو کے بعض غیر ذمہ دار ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں نے اس کے کئی معاشقے بیان کیے ہیں لیکن یہ سب فرضی اور من گھڑت ہیں اور ان میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔

شہزادی زیب النساء نے اپنی زندگی میں بہت سے باغات لگوائے، عمارتیں بنوائیں اور سرائیں بنوائیں مگر امتدادِ زمانہ نے قریب قریب ان سب کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لاہور کے چوبرجی باغ کو زیب النساء سے منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے چوبرجی باغ زیب النساء کی پھوپھی جہاں آرا بیگم نے لگوایا تھا۔ اپنے دور میں یہ بڑا شاندار باغ تھا مگر اب اس کی صرف ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے۔

شہزادی زیب النساء نے ماہ محرم ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) میں دلی میں وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر سترسٹھ سال کی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ ان دنوں دکن میں تھا اس کو شہزادی کی وفات کی اطلاع ملی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے حکم دیا کہ سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ نور محمد خاں شہزادی کے نام پر صدقات و خیرات غریبوں میں تقسیم کریں اور باغ سی ہزاری میں اس کے مقبرے کی

تعمیر کا انتظام کریں۔ چنانچہ زیب النساء کو جہاں آرا بیگم کے متروکہ باغ سی ہزاری واقع دہلی میں دفن کیا گیا اور اس پر شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔" سیر المنازل" مصنفہ سنگین بیگ بن علی اکبر بیگ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء کا مقبرہ دہلی میں کابلی دروازہ کے باہر سی ہزاری باغ میں تھا۔ مزار کے کتبہ پر یہ الفاظ کندہ تھے : "کل من علیھا فان۔ ہذا مرقد بنت الکبریٰ للعبد المذنب العاصی المخفوضۃ برحمۃ الرحیم الکریمۃ الحافظۃ زیب النساء المرجو دعاء الصالحین ان یدعوالھا بالغفران والرضوان وتاریخ فوتھا قولہ: وادخلی جنتی"

سر سید احمد خاں نے بھی" آثار الصنادید" میں اس مقبرے کا ذکر کیا ہے۔ ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۵ء میں حکومت ہند نے راجپوتانہ۔ مالوہ" ریلوے لائن بچھائی تو یہ مقبرہ اس کے راستے میں آ گیا اور اسے مسمار کر دیا گیا۔ اگرچہ اب اس مقبرے کا نام ونشاں باقی نہیں ہے لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ شہزادی زیب النساء دہلی میں فوت ہوئی اور وہیں دفن ہوئی۔

بعض تذکرہ نگاروں نے نواں کوٹ کے ایک مقبرے کو زیب النساء کا مقبرہ بتایا ہے۔ لیکن بہت سے محققین نے قوی دلائل وشواہد سے ثابت کیا ہے کہ اس مقبرے کا انتساب زیب النساء سے غلط طور پر کیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مقبرے کی ساخت شاہجہانی دور کی ہے۔ دوسری بات جو بہت اہم ہے، یہ ہے کہ یہ کسی عورت کا مقبرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ تیموریوں میں دستور تھا کہ وہ خواتین کی قبریں تہہ خانے میں بنواتے اور دوسری منزل پر خالی تعویز تعمیر کرتے۔ نواں کوٹ والے مقبرے میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی مرد کا مقبرہ ہے جو شاہجہاں کے عہد میں فوت ہوا۔ بعض مؤرخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقبرہ عہد شاہجہانی کے ایک امیر افضل خاں علامی (المتوفی ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء) کا ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ اس مقبرے میں ملا محمد فاضل خاں مدفون ہے جو عہد شاہجہانی اور عہد عالمگیری کا نامور امیر تھا۔ وہ ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء میں کشمیر میں فوت ہوا اور اس کی لاش لاہور میں دفن کی گئی۔ (واللہ اعلم بالصواب) بہرصورت یہ مقبرہ زیب النساء کا ہرگز نہیں۔ (مآثر عالمگیری۔ مخزن الغرائب۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۱۰۔ مشاہیر نسواں۔ ماہنامہ "عالمگیر" لاہور۔ تاریخ نمبر ۱۹۳۱ء۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۵ء۔ ماہنامہ "مہر نیمروز" کراچی اپریل ۱۹۵۵ء۔ مقالات شبلیؒ)

شہزادی زینت النّساء

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی دوسری صاحبزادی کا نام ہے۔ دلرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی بیگم کے بطن سے تھی۔ ۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ء ہجری میں پیدا ہوئی۔ دین سے محبت اور شریعت کی پابندی اس کو اپنے جلیل القدر والد سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ علوم دینی میں رتبۂ تبحر رکھتی تھی۔ علاوہ ازیں بڑی معارف پرور اور سخی تھی! اخلاق بھی بہت بلند تھے۔ ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴ء میں اس کا بھائی شہزادہ اعظم شاہ مرض استسقاء میں مبتلا ہوا تو وہ شہزادی زیب النّساء کے ساتھ مل کر دن رات اس کی تیمارداری میں مشغول رہی اور ہر قسم کا آرام اپنے اوپر حرام کر لیا۔ جب تک شہزادہ بیمار رہا وہ بھی اس کے ساتھ پرہیزی غذا استعمال کرتی رہی۔ اس نے خاص اپنی لاگت اور اہتمام سے شہر دہلی میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی۔ یہ مسجد دہلی کے محلہ دریا گنج میں اب بھی موجود ہے اور "زینت المساجد" کے نام سے مشہور ہے۔ شہزادی زینت النّساء نے ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء یا برروایت دیگر ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں وفات پائی اور "زینت المساجد" کے صحن میں دفن کی گئی۔

شہزادی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً کچھ شعر کہہ لیا کرتی تھی۔ زینت تخلص تھا۔ اس کی لوحِ مزار پر اس کا اپنا یہ شعر کندہ تھا ؎

مونسِ ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است
سایۂ از ابرِ رحمت قبر پوشِ ما بس است

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ مشاہیر نسواں۔ "ادیب" دہلی نومبر ۱۹۴۹ء)

شہزادی بدر النّساءؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تیسری بیٹی تھی۔ اورنگ آبادی محل کے بطن سے تھی۔ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء ہجری میں پیدا ہوئی۔ قرآن کریم کی حافظہ اور بڑی عالمہ فاضلہ تھی۔ اس نیک شہزادی نے صرف چوبیس برس کی عمر پائی اور ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء میں فوت ہوگئی۔

(ماہنامہ "ادیب" دہلی نومبر ۱۹۴۹ء)

شہزادی زبدۃ النساءؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی چوتھی بیٹی تھی۔ دلرس بانو کے بطن سے تھی۔ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء میں پیدا ہوئی دوسری بہنوں کی طرح یہ شہزادی بھی بہت لائق تھی۔ جملہ علومِ دینی میں یدطولیٰ رکھتی تھی اور احکامِ شریعت پر سختی سے عمل کرتی تھی۔ اس کو اپنے والد سے بہت محبت تھی۔ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں والد کی وفات کے چند دن بعد اس نے بھی پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ (ماہنامہ "ادیب" دہلی نومبر ۱۹۴۲ء)

حافظہ مریمؒ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے معتمد عنایت اللہ خان کی والدہ اور مرزا شکر اللہ خاں کشمیری کی زوجہ تھیں۔ ان کا خاندان نیشاپور سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ یہ خاندان علم و فضل کے اعتبار سے نہایت ممتاز مقام رکھتا تھا۔ بی بی مریم قرآن حکیم کی حافظہ ہونے کے علاوہ دوسرے دینی علوم میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ چنانچہ عالمگیر بادشاہؒ نے حافظہ مریم کو اپنی لختِ جگر زیب النساء کا اتالیق مقرر کیا۔ اس وقت شہزادی کی عمر چار سال چار ماہ اور چار دن کی تھی۔ حافظہ مریمؒ نے شہزادی کو خوب جی لگا کر پڑھایا اور پونے چار سال کے عرصے میں اسے سارا قرآن مجید حفظ کرا دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے زیب النساء کو دینیات کی بعض ابتدائی کتابیں بھی پڑھائیں۔ جب اورنگ زیب عالمگیرؒ کو شہزادی کے قرآنِ پاک حفظ کرنے کی اطلاع ہوئی تو اس کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ اس نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں عنایت کیں اور حافظہ مریمؒ کو بھی مالا مال کر دیا۔ (مآثر عالمگیری، دائرہ معارفِ اسلامیہ)

ملکہ ماہ پیکر

سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) کے اٹھارہویں فرمانروا سلطان مراد چہارم (۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ء تا ۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء) کی والدہ تھی۔ تخت نشینی کے وقت سلطان مراد کی عمر صرف بارہ برس کی تھی اور سلطنت کی حالت نہایت ابتر تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ سلاح خانوں میں ہتھیاروں اور گولہ بارود کی کمی تھی۔ ایشیائے کوچک مصر اور لبنان کے گورنروں نے سرکشی پر کمر باندھی تھی۔ بعض سرحدی مقامات پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ بحری قزاقوں نے بحیرہ اسود اور آبنائے باسفورس میں اودھم مچا رکھا تھا۔ غرض ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونا نوعمر سلطان کے بس کی بات نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی والدہ ماہ پیکر بڑی دانشمند، باہمت اور صاحبِ تدبیر خاتون تھی۔ اس نے بڑے عزم و استقلال کے ساتھ تمام مشکلات کا سامنا کیا اور اپنے بیٹے کا اقتدار قائم رکھا۔ سلطان جب بالغ ہوا اور رموزِ سلطنت سمجھنے لگا تو اس نے کاروبارِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر تمام اہم معاملات میں اپنی دانشمند والدہ کا مشورہ ضرور لیتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد فوج کا ایک حصہ بگڑ گیا اور اس نے سلطان کے سامنے وزیرِ اعظم کو قتل کر ڈالا۔ سلطان بڑا بہادر آدمی تھا، ماں کے مشورے کے مطابق وہ باغیوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے اپنے وفادار سپاہیوں کو ساتھ لے کر باغیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ سلطان نے بیشتر باغیوں کو قتل کر دیا جو باقی بچے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد سلطان ایشیائے کوچک کے سرکشوں کو زیر کر کے بغداد کی طرف بڑھا جس پر ایرانی قابض تھے۔ سلطان نے ایرانیوں کو شکست دے کر بغداد پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے بعد وہ یورپ پر لشکر کشی کی

تیاریاں کر رہا تھا کہ موت کا پیغام آگیا اور اس نے عین عالم شباب میں لاولد وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی ملکہ ماہ پیکر ہی کے حسنِ تدبیر کی مرہونِ منت تھی۔ مگر ابراہیم اچھا حکمران ثابت نہ ہوا۔ ملکہ نے اس کو بار بار سمجھایا کہ وہ عیاشی اور غفلت شعاری کو ترک کر دے لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر اس کے اللوں تللوں اور ناشائستہ حرکات سے تنگ آ کر عمائدِ سلطنت کا ایک وفد ملکہ ماہ پیکر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے درخواست کی کہ سلطان ابراہیم کو معزول کر کے اس کے بیٹے محمدؒ (چہارم) کو تخت نشین کیا جائے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ملکہ نے ان کو اجازت دے دی۔ چنانچہ ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء میں محمدؒ (چہارم) کو سلطان ابراہیم کی جگہ تخت نشین کیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ ملکہ ماہ پیکر نے پوتے کی سرپرستی بھی جاری رکھی اور کاروبارِ حکومت چلتا رہا۔ ملکہ نے ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۴ء میں وفات پائی تو حالات بگڑنے لگے لیکن خوش قسمتی سے ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء میں سلطان محمدؒ چہارم کو محمدؒ پاشا کیپرلی جیسا قابل وزیرِ اعظم مل گیا۔ اس نے حالات درست کر کے سلطنت کو پھر ترقی اور عروج کی راہ پر ڈال دیا۔

ملکہ ماہ پیکر کی یادگار ایک عظیم الشان جامع مسجد ابھی تک قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ یہ چینلی جامع کہلاتی ہے۔ ملکہ نے یہ مسجد ۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء میں تعمیر کروائی تھی۔

(تاریخِ اسلام۔ تاریخِ خلافتِ عثمانیہ۔ مشاہیرِ نسواں)

بی بی صاحب جی

عہدِ شاہجہانی کے نامور امیر نواب علی مردان[1] خان کی دختر نیک اختر تھی۔ اس کی شادی اسی دَور کے ایک نامور امیر خلیل خان یزدی کے بیٹے امیر خان سے ہوئی۔ صاحب جی نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور اس کی تربیت نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی تھی۔ امیر خان اس کی سلیقہ شعاری، ہوشمندی، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی بنا پر اس کی بے حد قدر کرتا تھا لیکن ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے امیر خان اس سے خفا ہو گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ صاحب جی ایک دفعہ چوڈولے (ایک قسم کی پالکی) میں بیٹھ کر دِلّی کے ایک راستہ سے گزر رہی تھی کہ ایک شاہی ہاتھی بدمست ہو کر ادھر آ گیا۔ صاحب جی کے خدام نے اس کا رُخ پھیرنے کے بہتیرے جتن کیے لیکن ہاتھی چوڈولے کے قریب پہنچ گیا۔ خدام بے بسی کے عالم میں اضطراری طور پر ادھر ادھر ہٹ گئے۔ قریب تھا کہ ہاتھی چوڈولے کو الٹ کر پاؤں تلے روند ڈالے۔ صاحب جی نے (اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے) چوڈولے سے چھلانگ لگا دی اور قریب کی ایک

---

[1] علی مردان خان کا والد گنج علی خان امرائے ایران سے تھا اور ۱۰۳۲ھ میں شاہِ ایران کی طرف سے قندھار کا ناظم تھا۔ شاہِ ایران اس کا بہت ادب کرتا تھا اور اسے ارجمند بابا کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس کی وفات پر شاہِ ایران نے اس کے بیٹے علی مردان خان کو قندھار کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شاہ عباس صفوی کا دورِ حکومت تھا۔ شاہ عباس نے ۱۰۳۸ھ میں وفات پائی تو اس کا پوتا صفی تختِ حکومت پر بیٹھا۔ وہ علی مردان خان کے مخالف امراء کے بھڑکانے پر اس سے بدظن ہو گیا۔ علی مردان خان کو بادشاہ کے رویّہ سے اس قدر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دکان میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ صاحب جی نے جان تو بچالی لیکن بے پردہ ہو جانے کے "حرم" میں امیر خان اس سے ناراض ہوگیا۔ (اس زمانے میں اونچے طبقہ کے لوگوں میں پردے کی نہایت سختی سے پابندی کی جاتی تھی)۔ شاہجہاں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

دکھ ہوا کہ اس نے شاہجہان کی اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور ۱۰۴۷ھ میں قندھار میں شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اس کے نام کے سکے مسکوک کرائے۔ شاہجہاں نے اس کی اس کارگزاری سے خوش ہو کر قیمتی خلعت اور تین لاکھ روپے بھیجے۔ دو لاکھ اس کے اپنے لیے اور ایک لاکھ اس کے عزیزوں اور خادموں کے لیے۔ چند ماہ بعد وہ قندھار شاہجہانی امراء کے حوالے کر کے رجب ۱۰۴۸ھ میں لاہور پہنچ گیا، جہاں بادشاہ اس وقت مقیم تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو ایک لاکھ روپیہ سفر خرچ کے طور پر دیا جائے اور بیس ہزار روپے اس کے ملازموں کو دیئے جائیں۔ اس کے علاوہ اس کے قریبی رشتہ داروں کو بھی نقد انعام اور قیمتی تحفے دے کر اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ پھر علی مردان خان کو بادشاہ نے شش ہزاری شش ہزار کا منصب دے کر ناظم کشمیر مقرر کیا (۱۰۴۸ھ) اگلے سال اس کو امیر الامراء بنا کر اور ہفت ہزاری ہفت ہزار کا منصب دے کر پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس دوران میں وہ کچھ عرصہ کے لیے بلخ و بدخشاں کی تسخیر کے سلسلے میں شہزادہ اورنگزیب کے ساتھ رہا اور اوزبکوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

علی مردان خان کا نظامتِ پنجاب کا زمانہ بہت شاندار تھا۔ اس نے صوبے کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا اور منکرات فحاشی اور فسق و فجور کو ختم کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس کے دورِ حکومت میں جو مشٹنڈے فقیر اور ملنگ بے نماز نظر آتے تھے اور فسق و فجور کے مرتکب پائے جاتے تھے ان کو گرفتار کر کے کابل بھیج دیا جاتا تھا۔

علی مردان خان ایک اعلیٰ درجے کا انجینئر بھی تھا اور اس کی زیادہ تر شہرت بھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو خبر ہوئی تو اس نے امیر خان کو بلا کر سمجھایا کہ تمہاری بیوی نے جو کچھ کیا اس
کے لیے وہ قابلِ تحسین ہے نہ کہ قابلِ تعزیر۔ فی الحقیقت اس نے اپنی جان ہی
نہیں بچائی بلکہ تمہاری عزت بھی بچائی۔ اگر ہاتھی چوڈولے کو پامال کر کے صاحب جی
کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالتا تو اس کی برہنہ لاش سرِ بازار پڑی ہوتی۔ اس وقت
تمہاری عزت کہاں رہتی؟ امیر خان کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس کا دل
صاحب جی کی طرف سے صاف ہو گیا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں امیر خان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بادشاہ
نے اس کو کابل کا گورنر مقرر کیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۰۸۸ھ (۱۶۷۷ء) سے لے کر اپنی وفات
۱۱۰۹ھ (۱۶۹۸ء) تک فائز رہا۔ کابل کے لوگ فطرتاً بڑے سرکش تھے لیکن امیر خان
نے صوبے میں مکمل امن و امان قائم رکھا اور کسی شورش پسند کو سر اٹھانے کا
موقع نہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر خان کے حسنِ انتظام کے پیچھے صاحب جی کی
بیدار مغزی اور فراست کارفرما تھی۔ وہ بڑی با تدبیر خاتون تھی اور امورِ سیاست
میں زبردست مہارت رکھتی تھی۔ چنانچہ امیر خان حکومت کا تمام کاروبار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اسی وجہ سے ہے۔ اس نے پنجاب اور کشمیر میں بے شمار اعلیٰ درجے کی عمارتیں بنوائیں۔ باغات
لگوائے۔ نہریں کھدوائیں۔ دو شہر بسائے۔ ان کے علاوہ دلی اور آگرے میں تعمیر ہونے
والی شاہی عمارتوں کی منصوبہ بندی میں بھی حصہ لیا۔ اگر اسے عہدِ شاہجہانی کا "میر تعمیرات"
کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ۱۰۶۷ھ میں وہ اسہال کے عارضے میں مبتلا ہو گیا اور بادشاہ
سے رخصت لے کر کشمیر روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں ۱۲ رجب ۱۰۶۷ھ کو فوت ہو گیا۔ اس
کی میت کو لاہور لا کر اس کی ماں کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس کا شاندار مقبرہ لاہور میں
ابھی تک اس کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ یہ مقبرہ اس نے اپنی والدہ کے لیے تعمیر کرایا تھا لیکن
تقدیر میں اسی کو اس کا اپنا مدفن بننا بھی لکھا تھا۔ (مآثر الامراء۔ نقوش لاہور نمبر)
(شاہکار لاہور اکتوبر ۱۹۳۹ء۔ چٹان لاہور ۱۰-۶-۲۲)

اسی کے مشوروں کے مطابق چلاتا تھا۔ ۱۱۰۹ھ ۱۶۹۸ء میں اس نے ایک دفعہ اپنے لشکر کے ساتھ کسی جگہ کا عزم کیا۔ صاحب جی اس کے ساتھ تھی۔ اثنائے سفر میں جب وہ ایک طویل وادی سے گزر رہا تھا کہ اس کا وقت آخر آ پہنچا اور وہ تیرِ قضا کا شکار ہو گیا۔ صاحب جی نے اس موقع پر کمال تدبّر اور حکمت سے کام لیا۔ وہ افغانوں کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر ان کو امیر خان کے مرنے کی خبر مل گئی تو وہ شورش برپا کر دیں گے جس پر قابو پانا بہت مشکل ہو گا۔ اس نے شوہر کی موت کے جانکاہ صدمے کو اپنے چہرے سے مطلق ظاہر نہ ہونے دیا اور ایک انتہائی قابلِ اعتماد آدمی کو امیر خان کا لباس پہنا کر اس کی پالکی میں بٹھا دیا۔ (یہ سفر امیر خان علالت کی وجہ سے پالکی میں بیٹھ کر کر رہا تھا) اس کی جھلک کھڑکی کے شیشہ سے باہر نظر آتی تھی۔ اس طرح سارا لشکر یہی سمجھتا رہا کہ امیر خان زندہ ہے۔ جب یہ سفر ختم ہوا تو صاحب جی نے شوہر کی موت کا اعلان کیا اور سوگ منایا۔ تمام سردارانِ قبائل نے اپنی خواتین کو تعزیت کے لیے اس کے پاس بھیجا اس نے ان کا بہت احترام کیا اور بہت خاطر مدارات کی۔ جب وہ رخصت ہونے لگیں تو ان کے ذریعے تمام سرداروں کو کہلا بھیجا کہ وہ حکومت کے وفادار رہیں اور دستور کے مطابق تمام واجبات ادا کرتے رہیں۔ اس صورت میں ان کے مراتب و اعزاز برقرار رہیں گے جب تک نیا گورنر نہیں آ جاتا میں حکومت کی نگران ہوں۔ اگر کسی نے حکومت کے احکام کی سرتابی کی کوشش کی تو پھر ؏

ہمیں میداں ہمیں چوگان و ہمیں گوئے

میں سرکشوں سے نبٹنا خوب جانتی ہوں۔ سرکشوں کا سر کچل کر مجھے دائمی عزت حاصل ہو گی اور شکست کھانے والوں کے حصے میں دوامی ذلت اور رسوائی آئے گی۔

افغان سرداروں نے صاحب جی کے کڑے تیوروں کو سمجھ لیا اور اس کے عہد میں کسی نے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی۔

اُدھر اورنگ زیب عالمگیرؒ کو امیر خان کی وفات کی اطلاع ملی تو اس کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں صوبۂ کابل میں بغاوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے اور نئے گورنر کے پہنچنے تک حالات خطرناک صورت نہ اختیار کر جائیں۔ اس نے فوراً امیر الامراء ارشد خان کو طلب کر کے اس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ جہاں پناہ تشویش کی کوئی بات نہیں امیر خان کی بیوہ بڑی لائق بہادر باہمت اور باتدبیر خاتون ہے۔ امیر خان کی زندگی میں بھی سارا کاروبارِ حکومت اسی کے مشورے سے چلتا تھا اور اب بھی اس کے جیتے جی کسی فتنہ کا احتمال نہیں ہے۔ چنانچہ عالمگیرؒ نے صاحب جی کو فرمان بھیجا کہ جب تک کوئی دوسرا گورنر مقرر نہیں کیا جاتا کابل کی صوبے داری کے فرائض تم ہی انجام دیتی رہو۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نئے گورنر کے تقرر میں تاخیر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ دو سال گزر گئے۔ اس عرصے میں صاحب جی نہایت خوش اسلوبی سے صوبے کا کاروبارِ حکومت چلاتی رہی۔ ۱۱۱۱ھ / ۱۷۰۰ء کے آغاز میں نئے گورنر نے اس کو ان فرائض سے سبکدوش کر دیا۔

امیر خان سے صاحب جی کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اس لیے اس نے صاحب جی سے پوشیدہ ایک اور شادی کر لی تھی۔ دوسری بیوی سے کئی بچے ہوئے۔ لعبدیں صاحب جی کو معلوم ہوا تو اس نے بڑی وسعتِ قلب سے کام لیا۔ ان بچوں کو اپنے منہ بولے بچے بنا لیا اور بڑی محبت شفقت اور تندہی سے ان کی تربیت کی۔

کابل کی گورنری سے فارغ ہونے کے بعد وہ حجاز روانہ ہو گئی اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ حجاز کے اثنائے قیام میں اس نے راہِ خدا میں ہزاروں روپے خرچ کیے۔ ایک طرف حاجیوں کی خوب خدمت کی اور دوسری طرف حجاز کے غریب اور حاجت مند باشندوں کو دل کھول کر روپیہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شریفِ مکہ اور اہلِ حجاز اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ غرض صاحب جی نے بڑی نیک نامی کی زندگی بسر کی اور عہدِ عالمگیری کی نامور خواتین میں شمار ہوئی۔ اس کا سالِ وفات کسی تذکرے میں درج نہیں ہے۔ (مآثر الامراء، مغل دورِ حکومت کا جائزہ وغیرہ)

بی بی جمال خاتونؒ

حضرت میاں میر لاہوری[1] رحمۃ اللہ علیہ کی بہن تھیں۔ اپنے عظیم المرتبت بھائی کی طرح زہد و عبادت میں یگانۂ روزگار تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے ایسی لو لگائی تھی کہ جو دعا کرتی تھیں فوراً درِ اجابت پر جا پہنچتی تھی۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے مستجاب الدعوات ہونے کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے اور ان کی بہت سی کرامات بیان کی ہیں۔ "سفینۃ الاولیاء" میں ہے کہ ایک دفعہ بی بی جمال خاتونؒ

---

[1] اسم گرامی میر محمد تھا۔ سیوستان (سندھ) کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام قاضی سائیں دتہ تھا۔ ۹۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں دینی علوم کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی۔ بارہ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ والدہ سے اجازت لے کر شیخ خضر سیوستانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ عرصہ تک سہون کے قریب ایک پہاڑی پر عبادات و ریاضات میں مشغول رہے۔ پھر مرشدِ گرامی نے انہیں رخصت کر دیا اور وہ ۲۵ سال کی عمر میں لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے مولانا سعد اللہؒ، مولانا نعمت اللہؒ اور مفتی عبد السلام لاہوریؒ سے کئی سال تک مزید تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے۔ وہاں ایک سال قیام کرنے کے بعد واپس لاہور آ گئے اور باقی تمام عمر یہیں وعظ و ہدایت اور ارشاد و تبلیغ میں گزار دی۔

بے حد عبادت گزار اور متبع سُنّت تھے۔ ان کی بدولت پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جہانگیر، شاہجہاں اور دارا شکوہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سکھ بھی ان کا اس قدر احترام

(باقی اگلے صفحہ پر)

نے دو من گیہوں ایک بڑے برتن میں بھر لیے۔ اللہ نے ان میں ایسی برکت دی کہ وہ پورے ایک سال تک ان کو روزانہ فقرا اور مساکین میں تقسیم کرتی رہیں۔
بی بی صاحبہ نے ۱۰۴۹ھ میں وفات پائی۔ (سفینۃ الاولیاء)

ملک شاد خانم

امیر تیمور کی نسل سے تھی۔ سلسلۂ نسب یوں ہے:
ملک شاد خانم بنت محمدؒ سلطان مرزا بن جہانگیر مرزا بن امیر تیمور
نہایت اعلیٰ درجے کی خوشنویس تھی اور قرآن حکیم کی خطاطی ایسی عمدگی سے کرتی تھی کہ اس کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہان نے اپنے ایک امیر نذر محمد خان کو والیٔ بلخ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ ۱۰۴۵ھ میں یا اس کے کچھ بعد واپس دلی آیا تو اس کے ساتھ بہت سے قیمتی تحالف تھے جو والیٔ بلخ نے شاہجہان کے لیے بھیجے تھے۔ ان میں ایک قرآن مجید بھی تھا جو خطِ ریحان میں نہایت عمدہ اور پختہ ملک شاد خانم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ آخر میں خانم نے اپنا نام اور نسب خطِ رقاع میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ درج کیا تھا۔ (سیر المتاخرین)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کرتے تھے کہ انھوں نے امرتسر میں اپنے دربار صاحب (گوردوارہ) کا سنگِ بنیاد حضرت کے دستِ مبارک سے رکھوایا۔ حضرت میاں میرؒ نے ۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو لاہور میں وفات پائی۔

بارھویں صدی ہجری

۱۔ شرف النساء بیگم (عابدہ، زاہدہ، قرآن اور تلوار کی عاشق)
۲۔ بی بی علینو ـــــ (غیرت مند)
۳۔ بی بی حلیمہ ـــــ (خطاطہ)
۴۔ نواب بیگم جان ـــ (نیک شریف، دردمند)
۵۔ بی بی فخر النساءؒ ـــــ (سخی دیندار)
۶۔ مغلانی بیگم ـــ (حوصلہ مند، مدبرہ)
۷۔ عادلہ خاتون ـــ (دانا، منتظم، مخیرہ)
۸۔ گنتا بیگم ـــــ (ادیبہ، شاعرہ)
۹۔ ملکہ قدسیہ زمانی (دانا، دور اندیش، مخیرہ)
۱۰۔ بی بی زبیدہ بنت اسعد (عالمہ فاضلہ، ادیبہ، شاعرہ)
۱۱۔ نواب صدر جہاں بیگم (پاکدامن، باخدا، فیاض، زیرک)
۱۲۔ بی بی بنی خانم ـ (سخی، دیندار، باحیا)
۱۳۔ امۃ الزہرا نواب بہو بیگم (دانشمند، رحم دل، مخیر)
۱۴۔ ممولا بیگم ـــــ (بیدار مغز۔ دانا)

شرف النساء بیگم رح

شرف النساء بیگم رح کا شمار بارھویں صدی ہجری کی نہایت عظیم المرتبت خواتین میں ہوتا ہے لیکن اس کی عظمت اور شہرت کے باوجود تاریخ کی کتابوں میں اس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں اور جو ملتی ہیں ان میں بہت الجھاؤ ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ حاکمانِ لاہور نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ اور نواب خان بہادر زکریا خاں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور قرآن پاک اور تلوار سے اس کا لگاؤ عشق کے درجے تک پہنچا ہوا تھا۔

حاکمانِ لاہور کے خاندان سے اس کا کیا تعلق تھا؟ اس کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں:-

۱ - وہ نواب عبدالصمد خاں کی بیٹی اور نواب زکریا خاں کی بہن تھی۔

۲ - وہ نواب زکریا خاں کی بیٹی اور نواب عبدالصمد خاں کی پوتی تھی۔

۳ - وہ نواب عبدالصمد خاں کی دوسری بیوی تھی اور نواب عبداللہ خاں کی ماں۔ نواب زکریا خاں اس کا سوتیلا بیٹا تھا جو بیگم جان کے بطن سے تھا۔

عام طور پر مؤرخین نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے البتہ منشی محمد الدین فوق کاشمیری مرحوم نے "مآثرِ لاہور" میں تیسری روایت کی صحت پر اصرار کیا ہے۔

(نقوش لاہور نمبر صفحہ ۳۶۱-۳۶۲)

مشہور مؤرخ سید عبدالقادر مرحوم (پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور) کا بیان ہے کہ "یہ فخرِ ملت خاتون عبدالصمد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ تمام عمر تارک الدنیا رہیں۔ یہ ہر وقت تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول رہتیں اور تلوار ان کے پاس پڑی رہتی۔"

(زمیندار لاہور - ۱۶ مئی ۱۹۴۵ء)

شرف النساء بیگم نے اپنے باغ میں عبادتِ الٰہی کے لیے ایک چبوترہ بنوایا تھا۔ وہ سیڑھی کے ذریعے اس چبوترے پر چڑھ جاتی اور روزانہ نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو جاتی۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک مرصّع تلوار بھی ہوتی تھی۔ تلاوتِ قرآن سے فارغ ہونے کے بعد وہ قرآنِ مجید اور تلوار کو چبوترے پر ہی چھوڑ دیتی اور خود نیچے اتر آتی۔ زندگی بھر اس کا یہی معمول رہا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے مرتے وقت اپنی ماں کو وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی قرآن اور تلوار اس سے جدا نہ کیے جائیں۔ چنانچہ اسی چبوترے میں اس کو دفن کر کے قرآنِ پاک اور تلوار اس کی قبر پر رکھ دیے گئے۔ پھر اس کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا جس کی تین اطراف بند کر کے ان پر سبز رنگ کے سرد کے درخت منقش کیے گئے۔ انہی کی نسبت سے یہ "سرو والا مقبرہ" مشہور ہو گیا۔ "سکھا شاہی" میں اس مقبرے کو اس خیال سے کھودا گیا کہ شاید وہاں کوئی خزانہ دفن ہے لیکن ظالموں کو تلوار اور قرآن کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا البتہ قبر پر پھر مٹی ڈال دی۔ انگریزوں کے زمانے میں اس مقبرے کی مرمت کرا دی گئی اور اسے محکمہ آثارِ قدیمہ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ مقبرہ ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے اور اس عظیم خاتون کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے شرف النساء بیگم کی زندگی کے حالات سنے تو وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے "قصرِ شرف النساء" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم کہی جو جاوید نامہ میں شامل ہے۔

اس نظم کے گیارہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

"قصرِ شرف النساء"

قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد	ہمارے سمندر میں کبھی ایسا موتی پیدا نہیں ہوا
ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد	کبھی کسی ماں نے ایسی بیٹی کو جنم نہیں دیا

خاکِ لاہور از مزارش آسماں
کس نداند رازِ او را در جہاں
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ
حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
تازِ قرآں پاک می سوزد وجود
از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود

سرزمین لاہور کو اس کے مزار نے آسمان بنادیا ہے
اس جہاں میں کوئی اس کے راز کو نہیں جانتا
وہ سراپا ذوق و شوق اور درد و داغ
خاتون پنجاب کے حاکم کی چشم و چراغ تھی
اس کی زندگی کی تپش اور حرارت قرآن پاک کی مرہون
منت تھی اس لیے ایک لمحہ کے لیے بھی تلاوت قرآن
سے فارغ نہ ہوتی تھی۔

در کمر تیغ دو رو قرآں بدست
تن بدن ہوش و حواس اللہ مست

اس کی کمر میں دو دھاری تلوار اور ہاتھ میں قرآن ہوتا
تھا اور اس کا تن بدن اور ہوش و حواس اللہ کی یاد
سے سرشار رہتے تھے۔

خلوت و شمشیر و قرآن و نماز
اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز
برلبِ او چوں دمِ آخر رسید
سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر!
سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوتِ حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن
تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

(جاوید نامہ - اقبالؒ)

اس کی زندگی تنہائی، تلوار، قرآن اور نماز سے عبارت تھی
کیسی مبارک زندگی تھی جو اللہ کی بندگی میں گزری۔
جب اس کا دم آخر قریب آیا تو اس نے ماں
کی طرف مشتاقانہ انداز میں دیکھا۔
اور کہا کہ اگر آپ کو میرے راز کا علم ہے
تو اس تلوار اور قرآن کی طرف دیکھئے۔
یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں
اور یہی مسلمانوں کی زندگی کا محور ہیں۔
اب میں دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں تو آپ سے کہتی ہوں
کہ تلوار اور قرآن کو مجھ سے جدا نہ کریں۔
مومنوں کے لیے تلوار کے ساتھ قرآن کافی ہے اور
ہماری قبر کے لیے یہی سامان کافی ہے۔

(مشاہیر نسواں۔ نقوش لاہور نمبر۔ شرف النساء)

بی بی عینو

تیموریوں کے دورِ زوال میں مرہٹے اس قدر زور پکڑ گئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ اس نازک وقت میں افغانستان کے فرمانروا احمد شاہ ابدالی (دُرّانی) نے ہندوستان پر یلغار کی اور جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ میں ایک خونریز لڑائی کے بعد پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو تباہ کن شکست دی۔ اس فتح عظیم کے بعد اس نے جلد ہی افغانستان کو مراجعت کی۔ جب قندھار دو منزل کے فاصلے پر رہ گیا تو احمد شاہ نے اپنی فوج کو تین روز کے لیے قیام کا حکم دیا تاکہ تھکے ماندے سپاہی طویل سفر کی زحمتوں اور کلفتوں کو دُور کر لیں، اطمینان کے ساتھ نہا دھو لیں، کپڑے بدل لیں اور تر و تازہ ہو کر قندھار میں داخل ہوں۔

ایک افغان سپاہی جسے اپنے اہل و عیال سے بچھڑے ہوئے مدت گزر چکی تھی عین وطن کے قریب پہنچ کر توقف و تاخیر کے حکم کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک مجاہد کی حیثیت سے احمد شاہ کے ساتھ ہندوستان پہنچا، مرہٹوں کے خلاف جہاد میں کامیابی کے بعد وطن واپس آیا اب وہ یہاں تین دن کیوں ٹھہرے۔ یہ سوچ کر لشکر سے نکل گیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ دو دن اپنے گھر میں ٹھہرنے کے بعد شاہی لشکر کے قندھار میں داخل ہونے سے پہلے اس سے جا ملے گا۔

سپاہی گھر پہنچا تو بچے موجود تھے مگر بیوی پانی لانے کے لیے قریب کی ندی پر گئی ہوئی تھی۔ سپاہی نے بچوں کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا، اتنے میں اس کی بیوی بھی آگئی۔ وہ شوہر کو گھر میں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کو نہ پانی پت کی لڑائی اور اس کے نتیجے کا کچھ علم تھا اور نہ شاہی لشکر کے قندھار کے قریب پہنچنے کی اطلاع

تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ اس کا شوہر بادشاہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے گیا ہوا ہے اور کافروں کے خلاف لڑتے ہوئے یا تو اس نے اپنی جان قربان کر دی ہوگی یا فتح و کامرانی کے بعد شاہی لشکر کے ساتھ گھر واپس آئے گا لیکن اس کے اس طرح تنہا وطن آنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے مسرت اور شادمانی کا اظہار کرنے کے بجائے غصے کے ساتھ شوہر سے سوال کیا:

"احمد شاہ بابا اور شاہی لشکر کہاں ہے اور جس مقصد کے لیے تم ہندوستان گئے تھے اس کا کیا بنا؟"

شوہر نے جواب دیا:—— "کافروں کو شکست فاش ہوئی ہے۔ شاہی لشکر فتح کے پھریرے اڑاتا وطن واپس پہنچ چکا ہے اور قندھار سے صرف دو منزل کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اہل و عیال کی محبت سے مجبور ہو کر جلد یہاں آگیا۔"

بیوی:—— "مجھے کیسے یقین آئے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست ہے لوگ تمہیں دیکھیں گے تو یہی کہیں گے کہ تو جہاد فی سبیل اللہ سے جی چرا کر بھاگ آیا ہے۔"

شوہر:—— "لیکن یہ شبہ کا کون سا موقع ہے شاہی لشکر دو دن کے بعد قندھار پہنچ جائے گا۔"

بیوی:—— "اگر یہ سچ ہے تو تم اسی وقت واپس چلے جاؤ۔ جب تک احمد شاہ بابا کا لشکر قندھار نہ پہنچے گا میں تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ میں عورتوں سے یہ طعنہ نہیں سن سکتی کہ میرا شوہر جہاد کے میدان سے بھاگ آیا ہے۔"

شوہر نے ہر چند کہا کہ وہ ایک دن گھر میں ٹھہر کر چلا جائے گا لیکن غیور اور باحمیت بیوی نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی تمہیں گھر میں نہیں بٹھا سکتی۔ مجبور ہو کر شوہر اٹھا اور شاہی لشکر کی طرف روانہ ہوگیا۔ لشکر میں پہنچا تو اجازت کے بغیر لشکر سے نکلنے کے جرم میں اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ احمد شاہ نے اس سے لشکر چھوڑنے کا سبب پوچھا تو اس نے ساری

کہانی شروع سے لے کر آخر تک سچ سچ بیان کردی۔ شاہ ابدالی اپنے وطن کی ایک بیٹی کی قومی حمیت کا حال سن کر بہت خوش ہوا۔ سپاہی کو سچ بولنے کی بناء پر فوراً رہا کردیا۔ قندھار پہنچا تو حکم دیا کہ سپاہی کی بیوی کو جس کا نام عینو تھا ایک کاریز (زمین دوز نہر جس میں چشموں سے پانی آتا ہے) انعام کے طور پر دی جائے — (افغانستان اور بلوچستان جیسے سنگلاخ علاقوں میں کاریز کی بے انتہا قدر و قیمت ہے) اس کاریز کا نام اب تک اس غیور خاتون کے نام پر "کاریز عینو" مشہور ہے۔ یہ قندھار سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر مشرقی سمت میں واقع ہے۔

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

بی بی حلیمہ

قسطنطنیہ کی نامور خطاطہ ہوئی۔ ایک عالم دین محمد صادق کی بیٹی تھی اس نے اپنے دور کے ایک سرآمدِ روزگار خطاط سید محمد علی سے کتابت کا فن سیکھا اور اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ سارے ملک میں اس کی شہرت ہوگئی۔ ترکی کا نامور خطاط محمد راسم افندی جو حلیمہ کا ہم عصر تھا، اس نے اس باکمال خطاطہ کی بے حد تعریف لکھی ہے۔

بی بی حلیمہ نے ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں وفات پائی۔

(تذکرہ الخواتین)

نواب بیگم جان

لاہور اور ملتان کے نامور گورنر (صوبیدار یا ناظم) نواب سیف الدولہ عبدالصمد خاں دلیر جنگ[1] کی اہلیہ اور نواب زکریا خاں[2] کی والدہ تھی۔ نہایت نیک شریف اور دردمند خاتون تھی۔ وہ نیکی کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی اس لیے لاہور کے لوگ اسے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں مغل پورہ اور اس کے ملحقہ محل بہل پورہ کی زمین پر عالی شان محلات اور خوبصورت مکانات تعمیر کرائے اور ایک باغ اور ایک خوشنما کاشی کار مسجد سے ان کو رونق دی۔ اسی کے

---

[1] نواب عبدالصمد خاں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ بادشاہ نے اس کو "چار صدی" کا منصب دیا۔ عالمگیرؒ کی وفات کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول تخت پر بیٹھا تو اس نے عبدالصمد خاں کو ہفت صدی کا منصب دیا۔ فرخ سیر نے اپنے دورِ حکومت (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) میں اس کو پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب دیا اور دلیر جنگ کا خطاب دے کر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں لاہور کا صوبیدار (گورنر) مقرر کیا۔ اس زمانے میں سکھوں کے ایک رہنما بندہ بیراگی نے سخت شورش برپا کر رکھی تھی۔ اس کے جتھے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے اور مسلمانوں پر سخت ظلم ڈھاتے تھے۔ فرخ سیر کے حکم سے عبدالصمد خاں نے بندہ بیراگی کا تعاقب شروع کر دیا اور آٹھ ماہ کی خونریز لڑائیوں کے بعد اسے لوہگڑھ میں تباہ کن شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ پھر اسے اور اس کے سات سو چالیس ساتھیوں کو دہلی بھیج دیا، جہاں سب کو قتل کرا دیا گیا۔ فرخ سیر نے اس کارگزاری کے صلے میں اسے ہفت ہزاری کا منصب اور سیف الدولہ کا خطاب دیا۔ اس کے بعد عبدالصمد خاں نے پنجاب کے ایک جاگیردار عیسیٰ خان، قصور کے تعلقہ دار حسین خان خویشگی اور جموں کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نام پر یہ محلہ "بیگم پورہ" مشہور ہوا۔ اس محلے کے اردگرد ایک مضبوط فصیل تھی جس کے غرب رویہ ایک وسیع بازار تھا۔ اس میں دنیا کی ہر چیز ملتی تھی۔ یہ محلہ ناظمانِ لاہور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

راجہ دھیپ دیو کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ فرخ سیر کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء میں نواب عبدالصمد خان کو ملتان کا اور اس کے بیٹے زکریا خان کو لاہور کا صوبیدار بنا دیا۔ نواب عبدالصمد خان نے ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں وفات پائی۔ نعش لاہور لائی گئی اور بیگم پورہ میں دفن کی گئی۔

نواب سیف الدولہ عبدالصمد خان دلیر جنگ، خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی اولاد سے تھا وہ بڑا بہادر اور نیک سیرت انسان تھا۔ اس کی راتیں مصلے پر اور دن گھوڑے کی پیٹھ پر بسر ہوتے تھے۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں تمام فتنوں کا قلع قمع کر دیا اور پنجاب میں ہر طرف امن اور خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

۲۔ نواب زکریا خان، نواب عبدالصمد خان کا لائق فرزند تھا۔ وہ نواب خان بہادر خان کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وہ ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء سے ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء تک لاہور اور ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء سے اپنی وفات ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء تک لاہور اور ملتان دونوں صوبوں (سارے پنجاب) کا صوبیدار (گورنر) رہا۔ وہ نہایت زیرک، عمل پرور، شجاع اور معاملہ فہم حکمران تھا۔ اس نے دو بڑے زمینداروں حسینی اور میر بابا کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ جموں کے راجے نے سرکشی کی تو خونریز لڑائی کے بعد اس کو شکست دی اور اس نے اطاعت قبول کر کے اپنی جان بچائی۔ اس کے زمانے کا سب سے اہم واقعہ نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ ہے۔ نادر شاہ کابل اور پشاور فتح کر کے پنجاب میں داخل ہوا تو نواب زکریا خان نے محمد شاہ کو بار بار پیغام بھیجا کہ نادر شاہ کے مقابلے کے لیے امدادی فوج بھیجی جائے لیکن بادشاہ نے اس کے پیغام پر کوئی توجہ نہ دی چونکہ مرکزی حکومت کی مدد کے بغیر نادر شاہ کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے نواب زکریا خان نے تیس لاکھ روپے دینے کے وعدے پر نادر شاہ سے صلح کر لی اور وہ لاہور کو چھوڑ کر دہلی کی طرف بڑھ گیا۔ اس طرح نواب کی حسن تدبیر نے لاہور کو اس تباہی اور قتل و غارت سے بچا لیا جس کا بعد میں دہلی کو سامنا کرنا پڑا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا گورنمنٹ ہاؤس تھا۔ نواب عبدالصمد خاں، بیگم جان اور نواب زکریا خان وفات کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

جب نادر شاہ دِلّی سے واپس ہوا تو اس نے چند دن لاہور میں قیام کیا۔ نواب زکریا خاں نے اس کی بہت خاطر مدارات کی اور صلحنامہ کے مطابق تیس لاکھ روپے اس کو دے دیئے۔ نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اس سے کہا کہ آپ کی کوئی فرمائش ہو تو بتائیں میں اسے پورا کروں گا۔ نیک دل نواب نے کہا کہ آپ اپنے ساتھ جو قیدی لیے جا رہے ہیں ان کو رہا کر دیں۔ نادر شاہ نے فوراً سب قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ان میں بڑے بڑے صاحب کمال اور ہنر مند کاریگر اور فن کار بھی تھے۔ اگر اس موقع پر نواب زکریا خان حب الوطنی کا مظاہرہ نہ کرتا تو ملک ان کے ہنر و کمال سے محروم ہو جاتا۔

مؤرخین نے نواب زکریا خاں کی رعایا پروری، بے تعصبی اور عدل و انصاف کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ وہ رات کو اکثر بھیس بدل کر شہر میں گشت کرتا رہتا تھا تاکہ لوگوں کے دکھ سکھ اور مسائل سے آگاہ ہو سکے۔ اس کی بے تعصبی کی یہ کیفیت تھی کہ مالیات کا محکمہ ایک ہندو دیوان لکھپت رائے کے سپرد کر رکھا تھا۔ کوٹ لکھپت کی بستی اسی دیوان کے نام سے مشہور ہوئی۔ نواب زکریا خاں کا دورِ حکومت صوبہ پنجاب اور ملتان کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ چونکہ ہر طرف امن و امان، عدل و انصاف اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ اس لیے رعایا کے تمام طبقوں میں نواب بے حد ہر دلعزیز تھا۔ ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اس نے لاہور میں وفات پائی تو شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ جب اس کا جنازہ اٹھا تو لوگوں نے اس پر اس قدر پھول برسائے کہ شہر میں پھول نایاب ہو گئے۔ نواب زکریا خاں بھی بیگم پورہ میں اپنے باپ کے پہلو میں آسودۂ خواب ہے۔

نواب زکریا خاں نے اپنے دورِ حکومت میں لاہور میں بہت سی شاندار عمارتیں بنوائیں مگر وہ سب دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت خواجہ خاوند محمود الشانؒ (المتوفی ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) کا گنبد اور دوسری مادھو لال حسین کے مزار کے قریب ایک مسجد ہے۔ یہ مسجد دوبارہ تعمیر کی گئی ہے۔ تاہم نواب موصوف کے دور کے چند کتبے ابھی اس میں محفوظ ہیں۔ (نقوش لاہور نمبر۔ تاریخِ پاکستان کے بڑے لوگ)

بعد اسی محلے میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبریں ایک چبوترے پر ابھی تک موجود ہیں۔ یہ بارونق اور متموّل محلہ ۱۱۶۲ھ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے میں برباد ہو گیا، اور اس کی ساری دولت حملہ آور افغان فوج نے لوٹ لی۔ بربادی کی رہی سہی کسر سکھوں کے عہدِ حکومت میں پوری ہو گئی۔ اب اس محلے کی عظمتِ رفتہ کے آثار چند کھنڈرات کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ بیگم جان کی بنوائی ہوئی مسجد کی وہ اگلی شان تو باقی نہیں رہی تاہم مسجد موجود اور آباد ہے۔ اس میں کاشی کاری کا جو کام باقی رہ گیا ہے وہ ابھی تک تازہ اور خوش رنگ نظر آتا ہے۔

(نقوش لاہور نمبر۔ لاہور عہدِ مغلیہ میں وغیرہ)

بی بی فخر النّساء

فرمانروائے ہند محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ ہجری تا ۱۱۶۱ھ ہجری) کے عہد کے ایک نامور امیر نواب شجاعت علی خان کی حرمِ خاص تھی۔ نہایت دانشمند اور خوش مذاق خاتون تھی۔ غربا و مساکین کی امداد اور دینی کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ اس کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو فخر النّساء کو سخت صدمہ ہوا۔ اس نے ۱۱۴۱ھ میں نواب مرحوم کی یادگار میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور اس کے لیے جائداد وقف کی۔ یہ مسجد اب تک شہر دہلی میں کشمیری دروازہ کے قریب موجود ہے اور فخر النّساء کے نام کی نسبت سے "فخر المساجد" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کی لوح پر یہ شعر کندہ ہیں:

خانِ دیں پرور شجاعت خاں بجنّت یافت جا | بارضائے حق تعالےٰ از طفیلِ مرتضیٰؑ
صدرِ خاتوناں کنیزِ فاطمہ فخرِ جہاں | یادگارش ساخت ایں مسجد بفضلِ مصطفیٰؐ

(مفتاح التواریخ)

مُغلانی بیگم

بارھویں صدی ہجری کی یہ نامور خاتون نواب عبدالصمد خان ناظم پنجاب (۱۱۲۵ھ / ۱۷۹۳ء تا ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء) کی نواسی، اور دُردانہ بیگم (خواہر نواب زکریا خان ناظم پنجاب از ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء تا ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء) اور دربارِ لاہور کے ایک با اثر امیر نواب جانی بیگ کی بیٹی تھی۔ اس کا شوہر نواب معین الملک عرف میر منو ناظم پنجاب (۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء) تھا[1]۔ مغلانی بیگم کی زندگی کے ابتدائی حالات کسی مُورّخ نے نہیں لکھے البتہ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئی تو والدین نے ان کا نام ثریا بیگم رکھا اور

---

[1] نواب معین الملک دہلی کے وکیلِ سلطنت نواب قمرالدین خان کا جواں بخت اور جواں ہمت فرزند تھا۔ وہ پہلے شاہِ دہلی کی طرف سے اور پھر احمد شاہ ابدالی کی طرف سے پنجاب کا ناظم رہا وہ ایک بیدار مغز، بہادر اور دور اندیش حاکم تھا۔ جس زمانے میں اس نے پنجاب کی حکومت سنبھالی، سکھوں نے ہر طرف شورش برپا کر رکھی تھی اور ان کی غارت گری سے خلقِ خدا عاجز آچکی تھی۔ نواب موصوف نے سکھ غارت گروں پر پے در پے ضربیں لگا کر پنجاب میں بڑی حد تک امن قائم کر دیا مگر افسوس کہ اس کا زمانۂ حکومت بہت مختصر ثابت ہوا۔

۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء میں وہ لاہور سے باہر نکل کر سکھ باغیوں کے ایک گروہ کا تعاقب کر رہا تھا کہ اچانک بیمار ہوگیا، اطبا نے جو لشکر کے ہمراہ تھے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس کا وقتِ آخر آچکا تھا، لشکر گاہ ہی میں فوت ہوگیا۔ اس کی وفات پر سکھوں نے بہت خوشی منائی مگر مسلمانوں میں کہرام مچ گیا۔ فی الحقیقت نواب معین الملک کی رحلت سے پنجاب میں مسلمانوں کا آفتابِ اقبال غروب ہوگیا اور چند سال بعد یہاں "سکھا شاہی" کا آغاز ہوگیا۔ (نقوش لاہور نمبر)

شادی کے بعد سسرال والوں نے اسے مراد بیگم کا نام دیا مگر اس نے تاریخ میں مغلانی بیگم کے نام سے شہرت پائی۔

صفر ۱۱۶۷ھ (نومبر ۱۷۵۳ء) میں اس کے شوہر نواب معین الملک نے اچانک وفات پائی تو فوج کے سپاہیوں میں شورش کے آثار نمودار ہوئے کیونکہ ان کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اس موقع پر مغلانی بیگم نے بڑے صبر و استقلال اور حوصلے سے کام لیا اور اپنے ذاتی خزانے سے سپاہیوں میں تنخواہ بانٹ کر انہیں خوش کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں اس نے تین دن میں تین لاکھ روپے تقسیم کیے۔ اس کے بعد وہ شوہر کی میت لے کر لاہور گئی اور اس کو باختلاف روایت بیگم پورہ میں یا موجودہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے نواح میں دفن کر دیا۔ چند دن بعد شاہِ دہلی (احمد شاہ) نے اپنے تین سالہ لڑکے محمود خاں کو لاہور اور ملتان کا ناظم اور نواب معین الملک کے دو سالہ فرزند محمد امین کو اس کا نائب مقرر کیا۔ امورِ سلطنت کا انتظام میر مومن خاں کے سپرد ہوا مگر یہ سب باتیں برائے نام تھیں۔ اصل حکمران مغلانی بیگم ہی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے محمد امین کے لیے احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان سے نظامتِ پنجاب و ملتان کی سند حاصل کر لی اور اس خوشی میں بہت بڑا جشن منایا۔ بدقسمتی سے شعبان ۱۱۶۷ھ (مئی ۱۷۵۴ء) میں محمد امین خان کا انتقال ہو گیا۔ اگرچہ مغلانی بیگم کو بیٹے کی وفات سے جانکاہ صدمہ ہوا لیکن اس نے ہوش و حواس قائم رکھے اور حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کی سند لینے کے لیے اپنے قاصد دہلی اور قندھار روانہ کر دیے لیکن اس کی توقع کے برعکس فرمانروائے ہند عالمگیر ثانی نے مومن خان کو لاہور اور ملتان کے صوبوں کا ناظم مقرر کر دیا۔ مغلانی بیگم نے بادشاہ کے فرمان کو صرف اتنی اہمیت دی کہ مومن خان کو برائے نام ناظم تسلیم کیا مگر ساری طاقت اور حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس زمانے میں بیگم کے سب سے بڑے مشیر تین خواجہ سرا میاں خوش فہم، میاں ارجمند اور میاں مہابت (محبت) تھے۔ بیگم پردے کی پابندی کی وجہ سے تمام امورِ حکومت انہی کے ذریعے انجام دیتی تھی۔

شامتِ اعمال سے یہ تینوں خواجہ سرا شاذ ہی کسی معاملے میں متفق ہوتے تھے اور اکثر ان کی طرف سے متضاد احکام جاری ہوتے تھے اس طرح نظامِ حکومت میں سخت خلل پیدا ہوا اور خواجہ مرزا خاں نے جسے مغلانی بیگم نے ایمن آباد کا حاکم بنایا تھا، ایک بااثر امیر بھکاری خان کے ایماء اور تعاون سے بیگم کو نظر بند کر کے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ بیگم نے نظر بندی ہی میں نہایت راز داری سے اپنے ماموں خواجہ عبداللہ خان کے ذریعے احمد شاہ ابدالی سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے پشاور کے ناظم جہان خان کے بھائی امان خان کو ایک مضبوط فوج دے کر لاہور روانہ کیا۔ امان خان نے خواجہ مرزا خان کو شکست دے کر مغلانی بیگم کو پھر مسندِ حکومت پر بٹھا دیا اور خواجہ عبداللہ خان کو اس کا نائب مقرر کیا۔ بیگم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بھکاری خان کی مشکیں کسوا کر اپنے حضور طلب کیا۔ جب وہ محل میں لایا گیا تو بیگم کے حکم سے محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں نے اس پر جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش کر دی یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا اور اس کی لاش شہر سے باہر خندق میں پھینک دی گئی۔[1] اس کے بعد بیگم نے خواجہ عبداللہ خان کی مدد سے نظم و نسق درست کرنے کی طرف توجہ کی مگر خواجہ خود حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ چنانچہ امان خان کے پیٹھ پھیرتے ہی اس نے اپنی فوج منظم کرنی شروع کر دی اور چند دن بعد مغلانی بیگم کو حراست میں لے کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی چونکہ خزانہ خالی تھا اس نے جبر و تشدد سے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں لاہور

---

[1] بھکاری خان نواب معین الملک کے زمانے میں حکومت کا مختار اور مدار المہام تھا۔ وہ بڑا وجیہ، پرہیزگار اور عالم آدمی تھا۔ لاہور کی سنہری مسجد اسی نے تعمیر کروائی (۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء)۔ چونکہ اس نے مغلانی بیگم کی مخالفت کی تھی، اس لیے مغلانی بیگم اس کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء میں جب بھکاری خان اس کے قابو میں آیا تو اس نے بڑے دردناک طریقے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش سے بھکاری خان نیم بیہوش ہو گیا تو مغلانی بیگم نے اپنے ہاتھ سے اس کو خنجر کے دو زخم لگائے جن سے اس کا دم نکل گیا۔
(سیر المتاخرین۔ نقوش لاہور نمبر)

میں یہ ضرب المثل مشہور ہوئی:

حکومت نواب عبداللہ نہ رہی چکی نہ رہیا چکھا (یعنی نواب عبداللہ کی حکومت میں نہ کسی کی چکی سلامت رہی ہے اور نہ چولھا بچا ہے۔)

خواجہ عبداللہ خان کی سختیوں کی وجہ سے اہل لاہور میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اسی زمانے میں جالندھر دوآب کے حاکم آدینہ بیگ نے لاہور پر لشکر کشی کی۔ خواجہ عبداللہ خان مقابلہ کیے بغیر سندھ کی طرف بھاگ گیا، اور آدینہ بیگ لاہور پر قابض ہو گیا مگر وہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد صادق بیگ خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے جالندھر واپس چلا گیا۔ ان حالات میں مغلانی بیگم نے دہلی کے وزیر غازی الدین عماد الملک کو مدد کے لیے خط لکھا۔ عماد الملک، نواب معین الدین کا بھانجا تھا اور اس سے مغلانی بیگم کی بیٹی عمدہ بیگم کی منگنی ہو چکی تھی۔

اس کے بعد کے جو حالات مؤرخین نے بیان کیے ہیں ان میں خاصا الجھاؤ ہے۔ مختصر یہ کہ عماد الملک نے آدینہ بیگ کے ذریعے لاہور پر قبضہ کر لیا اور اسی کے ذریعے مغلانی بیگم کو اپنی تحویل میں لے کر اپنے کیمپ ماچھی واڑہ سے دہلی واپس چلا گیا۔ دہلی سے مغلانی بیگم نے احمد شاہ ابدالی کو اپنے حالات سے آگاہ کیا اور اس کو دہلی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ۱۱۷۱ھ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی ایک جرار لشکر کے ساتھ دہلی میں وارد ہوا۔ مغلانی بیگم نے دہلی کے متمول لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے میں شاہ ابدالی کی بہت مدد کی اور اس کو یہاں تک بتایا کہ میرے خسر قمر الدین خان کی حویلی میں فلاں فلاں جگہ دولت گڑی ہے اور فلاں فلاں امیر کے پاس اتنی دولت ہے۔ اس نے خود بھی بہت سے قیمتی ہیرے شاہ ابدالی کی نذر کیے۔ اس کی کارگزاری سے خوش ہو کر شاہ نے اس کو سلطان مرزا کا خطاب دیا اور کہا کہ آج سے تم میری بیٹی نہیں بلکہ فرزند ہو۔ پھر اپنی پگڑی (جیغہ سمیت جس میں قیمتی موتی ٹنکے ہوئے تھے) اپنے سر سے اتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا لباس (یا شاہانہ خلعت) بھی اس کو عطا کیا۔ اسی شب کو اس نے عمدہ بیگم (دخترِ مغلانی بیگم) کی شادی

عماد الملک سے کر دی اور اس کی پہلی بیوی گنّا بیگم کو مغلانی بیگم کی کنیز بنا دیا۔ دہلی سے واپسی پر احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو پنجاب اور ملتان میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور مغلانی بیگم کے لیے تیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ لاہور میں اب وہ اپنی حویلی کے سوا کسی چیز کی مالک نہ تھی۔ اس صورت حال سے وہ سخت دل برداشتہ ہوئی اور لاہور میں عزلت گزینی کی زندگی گزارنے لگی۔ کچھ عرصہ آدینہ بیگ نے اس کو معقول مالی امداد دی مگر اس کی وفات (۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸ء) کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اُسی سال مغلانی بیگم جموں چلی گئی۔ وہاں کے راجہ رنجیت دیو نے اس کی شاندار پذیرائی کی، رہنے کو ایک محل دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا مگر بیگم نے یہ وظیفہ لینے سے معذرت کر دی۔ اس زمانے اس کے جو پرانے ملازم اور نمک خوار اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنی کمزور مالی حالت کے باوجود سب کو دو شالے دے کر رخصت کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دو سَو دو شالے تقسیم کیے۔ اس زمانے میں راجہ سکھ جیون کشمیر کا ناظم تھا اس کو بیگم کی طرف سے ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا۔ اس نے اس شرط کے ساتھ بیگم کو بھاری خراج کی پیش کش کی کہ وہ جموں سے باہر نہ نکلے لیکن بیگم نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ چند دن کے بعد وہ ایک عیار آدمی کے فریب میں آ کر اپنا رہا سہا اثاثہ بھی کھو بیٹھی اور بالکل قلاّش ہو گئی۔ ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ ابدالی پانچویں مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ جب اس کو مغلانی بیگم کی تباہ حالی کا علم ہوا تو اس نے تیس ہزار سالانہ آمدنی کا پرگنہ سیالکوٹ اس کو مرحمت کیا۔ مگر سکھوں کی شورش کی وجہ سے وہ اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ اب وہ گوناگوں مشکلات میں گھر گئی۔ اس نے حالات سے مجبور ہو کر اپنے خادم شہباز خان سے شادی کر لی اور زندگی کے آخری ایام گمنامی کی حالت میں جموں میں گزارے اور وہیں ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء یا ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء میں اس نے سفر آخرت اختیار کیا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ مغلانی بیگم بہت فیاض، سخی، خود دار اور بلند ہمت ۔۔رن تھی۔ وہ نہ صرف اپنے زیر دستوں اور ہوا خواہوں کو اکثر انعام و اکرام سے

نوازتی رہتی تھی بلکہ دوسرے حاجت مندوں کی بھی دل کھول کر مدد کیا کرتی تھی۔ اس نے بڑے پُرآشوب زمانے میں پنجاب میں امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کی اور نامساعد حالات کا مقابلہ بڑی ہمت اور جرأت سے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

اس کی رودادِ زندگی ایک ایسی داستانِ عبرت ہے جس کا مطالعہ کر کے بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

نہیں رہی ہے جہاں میں کسی کی بات بڑی
کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

("الشجاع" کراچی جون ۵۴ء "المعارف" ستمبر، اکتوبر، نومبر ۷۹ء "نقوش" لاہور نمبر)

عادلہ خاتون

احمد پاشا کی بیٹی اور بغداد کے عثمانلی والی سلیمان پاشا مرزا قلی (ابولیلیٰ) کی اہلیہ تھی وہ بڑی دانا، منتظم اور مخیر خاتون تھی اپنے شوہر کی زندگی میں وہ صوبے کا نظم و نسق چلانے میں سرگرم حصہ لیا کرتی تھی اور باقاعدہ اجلاس لگا کر بیٹھتی تھی، اس میں لوگ ایک خواجہ سرا کی وساطت سے اس کے سامنے عرضیاں پیش کرتے تھے اور وہ ان پر مناسب کارروائی کرتی تھی۔ اس نے ایک عالی شان مسجد اور ایک کاروال سرائے بھی تعمیر کرائی۔

۱۱۶۵ھ / ۱۷۶۱ ہجری میں سلیمان پاشا مرزا قلی نے وفات پائی اور علی پاشا اس کا جانشین مقرر ہوا تو عادلہ خاتون نے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ ینی چری (ترک فوج کا ایک فعال عنصر) علی پاشا کے خلاف ہو گئے۔ اس کے بعد پانچ ذی اثر مملوک امراء بھی اس کے مخالف ہو گئے۔ اس طرح وہ علی پاشا کی جگہ اپنے برادرِ نسبتی عمر پاشا کو ولایتِ بغداد کا حاکم مقرر کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ (۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ء)

عادلہ خاتون کا سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

(اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد۔۱۲)

نواب عماد الملک وزیرِ عالمگیر ثانی (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۳ھ) کی بیوی اور علی قلی خان والہ داغستانی ہفت ہزاری (امیرِ دربار عالمگیر ثانی) کی بیٹی تھی۔ بے حد حسین وجمیل تھی اور بہت اونچے درجے کی ادیبہ اور شاعرہ تھی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتی تھی۔ اس کے ادیبانہ اور شاعرانہ کمالات کا سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔

کہتے ہیں کہ وہ نہایت نازک اندام اور غیر معمولی ہلکے پھلکے وزن کی تھی۔ قضائے الٰہی سے اس کا لختِ جگر فوت ہو گیا۔ نواب عماد الملک نے خبر منگائی تو اس نے یہ شعر لکھ بھیجا ؎

از حالِ ما مپرس کہ دل چاک کردہ ایم
لختِ جگر بریدہ تہہِ خاک کردہ ایم

اس کے کچھ اور فارسی اشعار یہ ہیں:

تا کشیدے از نزاکت سرمۂ دنبالہ را — شد عصائے آبنوسی چشمِ بیمارِ ترا

جگر پُر سوز دل پُر خوں گریباں چاک و جاں بر لب — قضا از شرم می آید زسامانیکہ من دارم

فوارہ زہر گوشہ شرارہ برزد
از تارِ ترشح گرہ گوہر زد
نے نے غلطم کہ در رگ و ریشۂ آب
فصادِ ہوا ہزار جا نشتر زد

اردو میں بھی گُنّا بیگم کا کلام بہت ہے۔ شوخ تخلّص تھا۔ اصلاحِ سخن اس دَور کے نامور شعراء، میر قمرالدین منّت، میر سوز اور مرزا محمّد رفیع سودا وغیرہ سے لی۔

اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

رقیبوں سے وہ جس دم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اے دردِ جگر موتی پروتی تھی
ترے منہ کی تجلّی دیکھ کر کل رات حیرت سے
زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع روتی تھی

لے اڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے
گل نے سیکھی روشِ چاک گریباں ہم سے

شمع کو چہرۂ دلدار سے کیا ہے نسبت
کیونکہ یہ ہے رُخِ خنداں وہ ہے رونی صورت

شمع کی طرح کون رو جانے
جس کے جی کو لگی ہے وہ جانے

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسّر!
کیا جانیے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی!

مقابل ہوا گر لب کے ترے مصری چبا جاؤں
تری آنکھوں سے ہم چشمی کرے بادام کھا جاؤں

نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا
ہاتھ اک اور بھی لگانا تھا

شب کو میاں طلب میں تری ہم بھٹک بھٹک
جوں حلقۂ در یہ رہ گئے سر کو پٹک پٹک
میری بھی مشتِ خاک کا پایہ ہے کچھ ضرور
اے جامہ زیب! جائیو دامن جھٹک جھٹک

گنا بیگم کی زندگی کا آخری زمانہ کہاں اور کس طرح گزرا، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ گُناؔ بیگم کو عقدِ نکاح میں لانے سے پہلے نواب عماد الملک کی منگنی (نواب معین الملک عرف میر منو ناظمِ پنجاب اور مغلانی بیگم کی لڑکی) عمدہ بیگم سے ہو چکی تھی لیکن عمدہ بیگم کا نکاح ۱۱۷۰ھ میں نواب عماد الملک سے اس وقت ہوا جب مغلانی بیگم (بیوہ نواب معین الملک) دہلی میں قیام پذیر تھی اور سلطان احمد شاہ ابدالی بھی دہلی پر قبضہ کر کے وہیں مقیم تھا۔

تقریب نکاح میں احمد شاہ ابدالی بھی موجود تھا۔ اس نے گُناؔ بیگم کو مغلانی بیگم کے حوالے کر دیا اور کہا کہ وہ اسے اپنی کنیز تصور کرے اور عماد الملک کو حکم دیا کہ اپنی پہلی بیویوں کو طلاق دے دے۔ اس کے بعد گُناؔ بیگم پر کیا بیتی؟ تاریخ سے اس کا جواب نہیں ملتا۔

(گلشنِ بیخار۔ مشاہیر نسواں وغیرہ)

ملکہ قدسیہ زمانی

فرمانروائے ہند فرخ سیر (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ) کی صاحبزادی اور محمد شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) کی ملکہ تھی۔ اصل نام اودہم بائی تھا۔ نہایت قابل، دانا اور دوراندیش خاتون تھی۔ جب ۱۱۶۱ھ میں محمد شاہ نے وفات پائی تو اسی فتنہ (خانہ جنگی) کے برپا ہونے کا خدشہ پیدا ہوگیا جو اس سے پہلے ہر بادشاہ کی وفات پر پیدا ہوتا رہا تھا۔ اودہم بائی نے سات دن تک سلطنت کا کاروبار اس طرح جاری رکھا کہ کسی کے کانوں میں بادشاہ کے مرنے کی بھنک تک نہ پڑی۔ اس دوران میں اس نے احمد شاہ فرزند محمد شاہ کو اس حادثہ جانکاہ سے آگاہ کیا اور وہ جمادی الاولی ۱۱۶۱ھ میں سریر آرائے تاجِ شاہی ہوا۔ اس نے والدہ کو نواب بائی کا خطاب دیا۔ وہ نہایت نیک نہاد اور مخیر ملکہ تھی۔ بعد میں وہ "نواب قدسیہ صاحبہ زمانی" کے معزز لقب سے مشہور ہوئی۔ اس نے ۱۱۶۴ھ میں ایک خوشنما مسجد قلعہ شاہجہان آباد کے متصل تعمیر کی، جو سنہری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہیں:

شکرِ حق در عہد احمد شاہ غازی بادشاہ
خلق پرور دادگر شاہانِ عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نواب قدسی مرتبت
باد دائم فیضِ عام آں ملائک سجدہ گاہ
سعئ نواب بہا در صاحبِ لطف و کرم
ساخت تعمیرِ چنیں جا دید عالی دستگاہ
چاہ و حوض و صاف صحنش آبروئے زمزم است
ہر کہ از آبش طہارت کرد شد پاک از گناہ

سالِ تاریخش چو خورم یافت از الہام غیب
مسجدِ بیتِ مقدس مطلعِ نورِ الٰہ

تیسرے شعر میں جس "نواب بہادر" کا ذکر ہے وہ جاوید خاں خواجہ سرا تھا جس کو ملکہ زمانی کی سفارش پر بادشاہ نے نواب بہادر کا خطاب عطا کیا تھا۔

ملکہ زمانی نے ۱۱۶۲ھ میں دلی میں ایک اور عمارت بھی "شاہ مرداں" کے نام سے نواب بہادر جاوید خان کے ذریعے تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد میں ایک پتھر ہے جس میں پاؤں کا نشان کندہ ہے۔ خوش اعتقاد لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نقش پا ہے۔ ہر قمری مہینے کی بیس تاریخ کو "شاہ مرداں" میں اس نقشِ پا کی زیارت کے لیے آنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے۔

۱۱۶۷ھ میں احمد شاہ کو معزول کر دیا گیا تو ملکہ زمانی نے ہندوستان میں رہنا مناسب نہ سمجھا، اس نے اپنی بھانجی صاحبہ محل کا عقد احمد شاہ ابدالی سے کر دیا اور اس کے ساتھ افغانستان چلی گئی وہیں اس نے ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی۔

(مفتاح التواریخ۔ تاریخ ہند وغیرہ)

بی بی زبیدہ بنتِ اسعدؒ

قسطنطنیہ کے ایک نامور عالم اسعد بن شیخ الاسلام اسمٰعیل آفندی کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے علوم فقہ، لغت اور ادب میں ایسا کمال پیدا کیا کہ تمام عالم اسلام میں مشہور ہو گئیں۔ ان کو کتابوں کے مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتی تھیں اور ملک کے اونچے درجے کے شعرا میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کی شادی نقیب الاشراف درویش آفندی سے ہوئی۔ ان کی ایک بیٹی فطنت نے بھی شاعری میں بڑا نام پایا۔ بی بی زبیدہ نے ۱۱۹۴ھ میں وفات پائی۔

(مشاہیر النساء)

نواب صدر جہاں بیگم

بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا نام صدر النسّاء بیگم لکھا ہے۔ نواب سعادت خاں برہان الملک میر محمدؐ امین والی اودھ (۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء تا ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ چنانچہ اسے نہ صرف جملہ علوم دینی میں دسترس ہو گئی بلکہ وہ نہایت اعلیٰ اخلاق سے بھی آراستہ ہو گئی۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ وہ نہایت پاکدامن، خدا ترس، باحیا، فیاض، زیرک اور حوصلہ مند خاتون تھی۔ اس کی شادی اپنی پھوپھی کے بیٹے (برہان الملک کے بھانجے) مرزا محمد مقیم سے ہوئی جسے محمدؐ شاہ بادشاہ نے صفدر جنگ کا خطاب دیا۔ برہان الملک اور صفدر جنگ دونوں شاہی دربار میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ بادشاہ نے برہان الملک کو اودھ کا صوبہ دار (گورنر یا وزیر) مقرر کیا تو صفدر جنگ بھی اہلیہ کے ساتھ اپنے ماموں (خسر) کے پاس اودھ چلا گیا۔ برہان الملک نے اسے اپنا نائب مقرر کیا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں برہان الملک نے وفات پائی تو محمدؐ شاہ بادشاہ نے اس کی بیٹی نواب صدر جہاں بیگم کو اودھ کی صوبہ داری کا پروانہ عنایت کیا کیونکہ برہان الملک کا ایک کمسن لڑکا جسے باپ کی وفات کے بعد اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا چند دنوں کے بعد چیچک میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ نواب صدر جہاں بیگم نے اپنی طرف سے اپنے شوہر صفدر جنگ کو صوبے کا منتظم (یا نائب) بنا دیا۔

نادر شاہ کے حملے کے نتیجے میں سارے ہندوستان میں ہل چل مچ گئی اور جگہ جگہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسی زمانے میں امیٹھی (ضلع لکھنؤ) کے شیخوں نے حکومتِ اودھ کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور ایک لاکھ سے زیادہ گنوار اپنے ساتھ ملا لیے۔ صفدر جنگ نے بوجوہ ان کے مقابلے پر جانے سے پہلو تہی کی۔ اس پر

نواب صدر جہاں بیگم نے اس کو غیرت دلائی اور لکھنؤ سے باہر اپنی فوج جمع کرنے پر آمادہ کیا۔ جب یہ منظم فوج توپ خانہ سمیت شہر سے باہر خیمہ زن ہوئی تو تمام باغی مرعوب ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ اگر اس موقع پر نواب صدر جہاں بیگم غیر معمولی جرأت اور حوصلے سے کام نہ لیتی تو شاید حکومتِ اودھ کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس طرح وہ اکثر اپنے خاوند کو نہایت مفید مشورے دیتی رہتی تھی۔

نواب صدر جہاں بیگم کے بطن سے صفدر جنگ کا بیٹا شجاع الدّولہ پیدا ہوا۔ سنہ ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴ء) میں صفدر جنگ نے وفات پائی تو شجاع الدّولہ باپ کا جانشین ہوا۔ اسی زمانے میں اسے انگریزوں کو ادا کرنے کے لیے چالیس لاکھ روپیہ کی ضرورت پڑی۔ بیس لاکھ تو فراہم ہو گیا لیکن باقی بیس لاکھ کے لیے سخت پریشانی ہوئی۔ اس موقع پر نواب صدر جہاں بیگم اس کے آڑے آئی اور اس نے شجاع الدّولہ کی پریشانی کا حال سنتے ہی اسے بیس لاکھ روپیہ بھیج دیا۔

شجاع الدّولہ کے آغاز حکومت میں اودھ کے کھتریوں نے کچھ مغل سرداروں کے ساتھ مل کر اس کو معزول کرنے کی سازش کی مگر نواب صدر جہاں بیگم نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ سازش ناکام ہو گئی اور شجاع الدولہ نے اکیس برس تک اودھ پر حکومت کی۔

نواب صدر جہاں بیگم نے اپنے بیٹے کا پورا دورِ حکومت دیکھا۔ اس زمانے میں اودھ کا دار الحکومت فیض آباد تھا۔ نواب صدر جہاں بیگم نے اس شہر کو خوب آباد کیا تاہم اس کی احتیاط اور پرہیزگاری کی یہ کیفیت تھی کہ قلعہ فیض آباد کی زمین کے اصل مالکوں کو بڑی مشکل سے تلاش کیا اور زمین کی قیمت ادا کی تاکہ غصب کا گناہ اس کے سر پر نہ آئے اور قلعہ کے اندر بننے والی مسجد بھی غصب کی آلائش سے پاک رہے۔

اس کا معمول تھا کہ سال میں تین مہینے روزے رکھا کرتی تھی اور غربا و مساکین کی مدد پر ہر وقت آمادہ رہتی تھی۔ رفاہِ عامہ کے سلسلے میں اس نے کئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔

نواب شجاع الدّولہ نے ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں وفات پائی تو اس کا بیٹا آصف الدّولہ مسند نشین ہوا۔ اسی کے عہدِ حکومت (۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء) میں نواب صدر جہاں بیگم نے ستانوے برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے بیٹے نواب شجاع الدّولہ کی قبر کے پاس گلاب باڑی میں دفن ہوئی۔

(مشاہیر نسواں - بیگمات شاہانِ اودھ)

بی بی بنی خانم

قاسم علی خان کی بیٹی اور نواب نجم الدولہ اسحاق خان کی اہلیہ تھی۔ نواب نجم الدولہ، محمد شاہ بادشاہِ ہند (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ / ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے دربار میں وزیرِ اعظم سے بھی زیادہ اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا تو نواب نجم الدولہ کی پہلے جیسی قدر و منزلت نہ رہی، اس پر اس نے دربار کی ملازمت چھوڑ دی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بنگش افغانوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کی بیوہ بنی خانم کچھ مدت تو دلی میں رہی لیکن جب وہاں مرہٹوں جاٹوں وغیرہ نے لوٹ مار مچائی تو دلی سے فیض آباد (اودھ) چلی گئی۔ اس وقت نواب شجاع الدولہ کا دورِ حکومت تھا (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۸۸ھ)۔ اس نے بنی خانم کا بے حد احترام کیا۔ اس کو بے شمار تحفے تحائف بھیجے اور پانچ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ بیگم کے پاس اپنا اندوختہ بھی بہت کچھ تھا اس طرح اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو گئی لیکن جس چیز نے اس کو شہرتِ دوام بخشی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنی دولت مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ جلد ہی سارے ملک میں اس کی سخاوت اور فیاضی کی دھوم مچ گئی۔ لوگ دلی، لکھنؤ اور دوسرے مقامات سے اس کے پاس آتے اور منہ مانگی مرادیں پاتے تھے۔ کبھی کوئی سائل اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر روپیہ حاجت مندوں میں تقسیم کرتی تھی، اور سب اس کو دعائیں دیتے جاتے تھے

بنی خانم اپنے عزیزوں اور دوسرے لوگوں میں ایسی لڑکیوں کی تلاش

میں رہتی جو شادی کی عمر کو پہنچ جاتیں لیکن ماں باپ غریبی کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے نہ کر سکتے تھے۔ بنی خانم ایسی لڑکیوں کی شادی کے اخراجات اپنے ذمے لے لیتی اور یہ کارِ خیر بڑے احسن طریقے سے انجام دیتی تھی مخیر ہونے کے علاوہ بنی خانم بہت پرہیزگار، باعصمت اور پردہ دار بی بی تھی اس کا ایک سگا بھائی آغا علی خان تھا۔ بیگم کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بیگم کی اپنی اولاد کوئی نہ تھی اور دوسرے اس لیے کہ ماں باپ کی نشانی صرف یہ اکلوتا بھائی تھا اور وہی اس کا وارث تھا۔ بھائی سے اتنی محبت کے باوجود بیگم کو شریعت کا اس قدر پاس تھا کہ اس نے آغا علی خان کو تاکید کر رکھی تھی کہ جب کبھی مجھ سے ملاقات کے لیے آنا چاہو تو پہلے خبر ضرور کر دو جب وہ آتا تو بیگم نہایت احتیاط سے اپنا سارا جسم کپڑے سے ڈھانکتی اور سوائے چہرے کے کوئی حصۂ جسم کھلا نہ چھوڑتی۔

اس نیک بی بی نے ۱۵ شوال ۱۲۱۱ھ ہجری کو ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ تاریخ فرح بخش)

اَمَۃُ الزّہرا نواب بہو بیگم
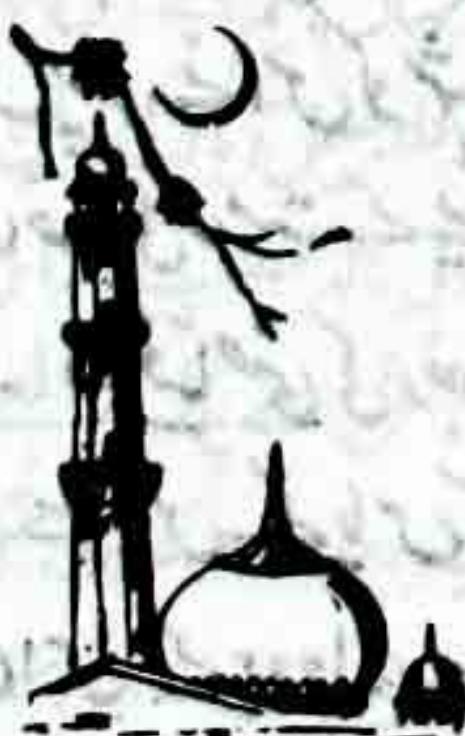
نواب موتمن الدولہ محمّد اسحاق خاں صوبہ دار گجرات کی حقیقی اور فرمانروائے ہند محمّد شاہ (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۸ھ ۱۷۴۸ء) کی منہ بولی بیٹی تھی۔ ۱۱۳۴ھ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئی اور پیدائش کے فوراً بعد اُسے محمّد شاہ بادشاہ کی خواہش پر شاہی محل میں بھیج دیا گیا۔ بادشاہ نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا اور بچی شاہی محل میں پرورش پانے لگی۔ اس کی تعلیم بھی شاہی محل میں ہوئی۔ لڑکی بچپن ہی سے بڑی ذہین اور عقلمند تھی۔ بادشاہ نے اس کا نام اَمَۃُ الزّہرا رکھا، اسے ہر قسم کا ہنر سکھایا اور آدابِ شاہی سے واقف کیا۔ جب اس کی عمر چوبیس برس کی ہوئی تو نواب صفدر جنگ والیٔ اودھ نے اپنے بیٹے شجاع الدّولہ کے لیے اَمَۃُ الزّہرا کے رشتے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے پیغام قبول کر لیا اور ۱۱۵۸ھ ۱۷۴۵ء میں اپنی منہ بولی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے شجاع الدّولہ سے کر دی۔ بادشاہ نے جہیز میں اس قدر زر و جواہر اور مال اسباب دیا کہ حد بیان سے باہر ہے۔ مختلف صوبوں کے گورنروں نے بھی بادشاہ کی بیٹی جان کر گرانقدر تحائف، مال اسباب، مرصّع زیورات اور نقد رقوم کی صورت میں بھیجے علاوہ ازیں حقیقی باپ نواب موتمن الدولہ محمّد اسحاق خاں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جس قدر مال و اسباب اور زر و جواہر وغیرہ دیئے اُن کی مالیت کروڑوں روپے تک پہنچتی تھی۔

اَمَۃُ الزّہرا کو سسرال کی طرف سے نواب بہو بیگم کا خطاب ملا۔ اس خطاب نے اتنی شہرت پائی کہ لوگ اس کا اصل نام بھول گئے۔ ساس سسر اور شوہر بہو بیگم کے بے حد قدر دان تھے کچھ اس کے اوصاف کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ وہ کروڑوں کی دولت اپنے ساتھ لائی تھی۔ ساس، نواب صدر جہاں بیگم نے تو بہو کو فقط پان کھلانے کے نام سے کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی جائداد لکھ دی اور اپنی

جاگیر بھی اس کے نام کر دی۔ ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء میں نواب بہو بیگم کے بطن سے نواب آصف الدولہ پیدا ہوا۔ اس سے اس کی عزت و توقیر میں اور اضافہ ہو گیا۔

۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ نے وفات پائی اور نواب شجاع الدولہ مسند حکومت پر بیٹھا۔ وہ عمر بھر نواب بہو بیگم کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آتا رہا۔ اگرچہ اس کی اور بھی بیویاں تھیں لیکن بہو بیگم کو سب پر فوقیت حاصل تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے بلند آواز سے گفتگو کرے۔ گویا وہ اودھ کی خاتونِ اوّل تھی۔

نواب بہو بیگم نہایت دانشمند، رحم دل اور مخیّر خاتون تھی۔ اس کی دولت اور جاہ و حشمت کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا، مگر وہ اپنی دولت کو سینت سینت کر رکھنے کے بجائے بے دریغ خرچ کرتی رہتی تھی۔ دس ہزار پیادے اور سوار براہِ راست اس کے ماتحت تھے جن کے ساتھ سینکڑوں ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے۔ ان سب کو بہو بیگم کی سرکار سے تنخواہ اور خوراک وغیرہ ملتی تھی۔ علاوہ ازیں ایک لاکھ سے زیادہ ملازمین اور متوسلین اس کے طفیل پرورش پاتے تھے۔ یہ سب لوگ ایسے خوش و خرّم تھے جیسے بچّہ اپنی ماں کی گود میں ہوتا ہے۔

نواب شجاع الدّولہ نے ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ نواب آصف الدّولہ تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اس کے تیئس سالہ دورِ حکومت میں بھی بہو بیگم کا فیضِ عام جاری رہا۔ اس زمانے میں اس کو جنابِ عالیہ کہا جاتا تھا۔ آصف الدّولہ بہو بیگم کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دوسری بیگمات سے شجاع الدّولہ کے چوبیس لڑکے اور سولہ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے بعض کی شادی ہو چکی تھی اور ان کی اولاد تھی۔ شجاع الدّولہ کی وفات کے بعد آصف الدّولہ تو باپ کا جانشین ہوا باقی سب سوتیلے لڑکے لڑکیوں کو بہو بیگم نے اپنے پاس بلایا۔ ہر ایک کو گلے لگایا پیار کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پھر آصف الدّولہ سے کہا کہ از روئے صلہ رحمی تم پر ان سب کی پرورش فرض ہے۔ نواب نے تمام لڑکوں کے لیے دو ہزار روپیہ فی کس اور تمام لڑکیوں کے لیے سات سو روپیہ فی کس ماہوار صرفِ خاص

کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ خاصہ سب کا نواب کے باورچی خانہ سے مقرر رہا۔ دوسری بیگمات کی تنخواہیں بدستور قائم رہیں۔

نواب آصف الدولہ نے اپنے عہد حکومت میں فیض آباد کی بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا تو شہر کو آراستہ کرنے پر بے تحاشا روپیہ صرف کیا۔ ویسے بھی وہ شاہ خرچ بلکہ فضول خرچ تھا۔ ہاتھ تنگ ہوا تو فوراً ماں کے پاس پہنچا اور اس سے پچاس لاکھ روپیہ لے کر ٹلا۔ کئی مرتبہ نواب بہو بیگم سے روپیہ لایا اور لکھنؤ میں لٹا دیا۔ ایک دفعہ ساس نواب صدر جہاں بیگم نے بہو بیگم کو ہاتھ روکنے کا مشورہ دیا تو کہا، میرا تو سوا اس لڑکے کے کوئی وارث نہیں ہے اب نہ دوں تو مرنے کے بعد ہر چیز کا یہی مالک ہوگا۔ خدا کی قدرت آصف الدولہ نے ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء میں ماں کی زندگی میں انتقال کیا۔ اس کی جگہ اس کا سوتیلا بھائی نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوا۔ اس وقت فیض آباد میں سخت بدامنی تھی۔ نواب بہو بیگم نے وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور شہر کی حالت سدھارنے کا کام ایک مرد جری داراب علی خان کے سپرد کر دیا۔ اس نے تمام غنڈوں اور سرکشوں کے کس بل نکال دیئے اور مکمل امن و امان قائم کر دیا۔ بہو بیگم نے سعادت علی خاں کا سارا زمانۂ حکومت بھی دیکھا ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۵ء میں نواب سعادت علی خان کی وفات کے بعد اس کا فرزند غازی الدین تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں نواب بہو بیگم نے ۲۵ محرم ۱۲۳۱ھ (مطابق ۲۷ دسمبر ۱۸۱۵ء) کو وفات پائی۔ انتقال سے پہلے اس نے وصیت کی کہ جو روپیہ اور جائداد میں چھوڑے جا رہی ہوں اس میں سے تین لاکھ روپیہ میرے مقبرے کی تعمیر پر اور ایک لاکھ روپیہ مذہبی رسوم ادا کرنے پر صرف کیا جائے۔ علاوہ ازیں دس ہزار سالانہ کی جائداد ان لوگوں کی پرورش کے لیے ہوگی جو اس کی قبر پر قرآن خوانی کرتے رہیں۔

اس طرح بہو بیگم اپنی وفات کے بعد بھی بیسیوں لوگوں کی روزی کا بندوبست کر گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بہو بیگم نے دس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کا ایک گاؤں اپنی موت سے کافی عرصہ پہلے غریبوں مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔

(بیگمات شاہان اودھ۔ مشاہیر نسواں)

ممولا بیگم (بی بی)

بھوپال[1] کے والی نواب یار محمد خان (المتوفی ۱۱۶۷ھ) کی اہلیہ اور نواب فیض محمد خاں (المتوفی ۱۱۹۱ھ ہجری) کی سوتیلی والدہ تھی۔ نہایت بیدار مغز اور دانا خاتون تھی۔ نواب فیض محمد خاں کی صغر سنی میں ریاست کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں مرہٹوں کا بڑا زور تھا۔ انہوں نے چاہا کہ مسلمانوں کی اس ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا جائے لیکن ممولا بیگم نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ مرہٹوں کا پیشوا بالاجی راؤ صرف سات پرگنے لے کر راضی ہو گیا اور اسی طرح ریاست مرہٹوں کی دست برد سے بچ گئی۔ اگر وہ موقع شناسی سے کام نہ لیتی تو ریاست کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ صاحب تدبیر ہونے کے علاوہ ممولا بیگم بڑی فیاض اور انصاف پسند بھی تھی۔ نواب فیض محمد خان کے بعد نواب حیات محمد خاں ۱۱۹۱ھ میں مسند نشین ریاست ہوا تو اس نے بھی ممولا بیگم کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا۔ اکثر امورِ ریاست وہ اس کی رائے سے انجام دیتا تھا یہاں تک کہ وزیروں کا تقرر بھی اسی کے مشورے سے کرتا تھا۔

ممولا بیگم نے دو عظیم الشان مسجدیں بھوپال میں بنوائیں جو آج تک موجود ہیں۔ اس نے ۸۰ برس کی عمر پا کر ۱۲۰۹ھ میں انتقال کیا۔ (تاریخ نوری۔ مشاہیر نسواں)

---

[1] بھوپال وسطی ہند کی ایک خوشحال مسلمان ریاست تھی۔ ۱۹۵۱ء میں اس کی آبادی ۸۳۸۴۷۴ تھی۔ برِ کوچک پاک و ہند کی آزادی کے کچھ عرصہ بعد جب بھارت کی حکومت نے ملک کی تمام ریاستوں کو مختلف صوبوں میں ضم کر دیا تو ریاست بھوپال کو ختم کر کے صوبہ "مدھیا پردیش" میں شامل کر دیا۔ اس ریاست کا رقبہ ۶۹۲۸ مربع میل تھا اور اس میں ایک بڑا شہر (بھوپال) ۳۰ پرگنے، ۳۰ قصبے اور اڑھائی ہزار کے لگ بھگ گاؤں تھے۔

تیرھویں صدی ہجری

۱۔ نواب قدسیہ بیگم (دانا، فیاض، دیندار، دلیر)

۲۔ بی بی رابعہ جیلانیہ (عابدہ، زاہدہ، عارفہ)

۳۔ نواب سکندر بیگم (والیۂ ریاست، دیندار، مدبرہ، مخیر)

۴۔ نواب شاہجہان بیگم (والیۂ ریاست، عالمہ فاضلہ، شاعرہ، مخیر، دیندار، رعایا پرور)

۵۔ زکیہ بیگم (راسخ العقیدہ، موحد، دیندار، فیاض، باوفا)

۶۔ دختر شاہ محمد اسحاق — (عالمہ فاضلہ)

۷۔ بی بی شرف خانم — (شاعرہ)

۸۔ نواب ملکہ کشور صاحبہ (نیک سرشت، دیندار عالی دماغ، حوصلہ مند)

۹۔ ملکہ بزم عالم (دیندار، مخیر، نیک سیرت)

۱۰۔ بی بی آسیہ خانم — (عابدہ، سخی)

۱۱۔ بی بی عائشہ تیموریہ — (شاعرہ)

۱۲۔ ملکہ شرافت محل (علم دوست، دیندار، فیاض)

۱۳۔ گلبدن باجی — (دیندار، دیانتدار)

۱۴۔ قرۃ العین طاہرہ — (عالمہ، ادیبہ، خطیبہ شاعرہ، بابی مذہب کی سرکردہ رہنما)

۱۵۔ بی بی کیفی — (شاعرہ)

۱۶۔ سری خانم — (شاعرہ)

۱۷۔ حیات النساء بیگم حیا (شاعرہ، عالمہ، فاضلہ)

۱۸۔ بی بی فطنت خانم — (شاعرہ)

۱۹۔ ملکہ زینت محل (ہنرمند، سلیقہ شعار، باوفا بیوی)

۲۰۔ نواب حضرت محل (مدبرہ، نڈر، بہادر، غیرت مند)

۲۱۔ عزیز النساء بیگم (روشن دماغ، دانشمند، دیندار، نیک سرشت، دور اندیش ماں)

۲۲۔ نواب اختر محل اختر — (شاعرہ)

۲۳۔ بی بی لیلیٰ خانم — (〃)

۲۴۔ مہ لقا بائی چندا (شاعرہ، عالمہ، فنونِ سپہگری میں طاق)

۲۵۔ بی بی لحاظ النساء — (محدثہ)

۲۶۔ ملکہ پرتو پیالہ (نیک سیرت، باحیا، مخیر)

۲۷۔ بادشاہ بیگم دہلوی — (خطاطہ)

۲۸۔ بی بی شمس النساء (عالمہ، فاضلہ، واعظہ)

۲۹۔ صولت النساء بیگم — (مخیرہ، دیندار)

۳۰۔ بی بی اسماء عبرت — (خطاطہ)

۳۱۔ بی بی رشحہ — (شاعرہ)

نواب قدسیہ بیگم

اصل نام گوہر بیگم تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئیں۔
نواب غوث محمد خان (فرزند نواب حیات محمد خان والی بھوپال) کی بیٹی تھیں۔

ان کی شادی نواب نظیر الدولہ نظیر محمد خان والی بھوپال سے ۱۲۳۲ھ میں ہوئی۔ تین سال بعد نواب نظیر الدولہ فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک خرد سالہ بچی سکندر بیگم چھوڑی۔ عمائد ریاست نے اس کی والدہ قدسیہ بیگم کو مختار ریاست مقرر کیا۔ اسی سال نواب قدسیہ بیگم کے والد نواب غوث محمد خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ لیکن انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا اور ریاست کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے چلاتی رہیں۔ وہ بڑی دانا، فیاض دیندار اور دلیر خاتون تھیں۔ انہوں نے بھوپال میں ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی اور لاکھوں روپے خرچ کرکے بھوپال کے شہریوں کو پانی مہیا کرنے کے لیے واٹر ورکس بنوایا۔

۱۲۵۰ھ ہجری میں نواب قدسیہ بیگم نے اپنی لخت جگر سکندر بیگم کی شادی نواب جہانگیر محمد خاں سے کی۔ شادی کے بعد نواب جہانگیر محمد خان نے مطالبہ کیا کہ عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اس پر قدسیہ بیگم نے ناراض ہو کر اس کو نظر بند کر دیا لیکن وہ کسی طرح نظر بندی سے نکل کر سیہور پہنچ گیا اور کئی مواضعات پر قبضہ کر لیا۔

اب قدسیہ بیگم اور نواب جہانگیر محمد خان میں باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی۔ آخر انگریزوں نے مداخلت کرکے جنگ بند کرا دی اور ریاست

نواب جہانگیر محمد خان کے سپرد کر کے نواب قدسیہ بیگم کو چار لاکھ کی جاگیر دے دی۔ یہ ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۷ء کا واقعہ ہے۔

نواب قدسیہ بیگم نے ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔

نواب قدسیہ بیگم کو عبادت و ریاضت سے بڑا شغف تھا۔ روزانہ رات کو دو بجے کے قریب بیدار ہوتیں اور صبح آٹھ بجے تک تلاوتِ قرآن، نماز اور ذکر اذکار میں مشغول رہتیں۔ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد کی بھی پابند تھیں، اور نوافل بھی بڑی کثرت سے پڑھتی تھیں۔ اپنے متعلقین اور ملازمین کو بھی نماز کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ صدقات و خیرات کرنے میں بڑی کشادہ دست تھیں اور سینکڑوں غرباء اور مساکین ان کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے۔

(تاریخِ لودی۔ تاج الاقبال۔ مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی رابعہ جیلانیہؒ

مرزا محمد کی دختر نیک اختر تھیں۔ جو رشت کے رہنے والے تھے اور گیلان کے وزیر تھے۔ بی بی رابعہ کی شادی مرزا اسمٰعیل سے ہوئی۔ یہ بڑی خدا رسیدہ خاتون تھیں، اور علم و عرفان میں بہت بلند مقام رکھتی تھیں۔ ان کے زہد و عبادت کو دیکھ کر شاہِ ایران نے ان کو "رابعہ ثانیہ" کا خطاب دیا تھا، اور ہزار تومان سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے کرمان میں ایک شاندار عمارت بنوائی جہاں بڑے بڑے اولیاء و مشائخ کے مزار ہیں۔ بی بی رابعہ جیلانیہؒ نے ۱۲۸۰ ہجری میں شہر قم میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

نواب سکندر بیگم

پیچھے نواب قدسیہ بیگم کے حالات میں ذکر آچکا ہے کہ سکندر بیگم (دخترِ نواب نظیر الدولہ نظیر محمدؐ خان و قدسیہ بیگم) کی شادی ۱۲۵۰ھ میں نواب جہانگیر محمدؐ خان سے ہوئی اور ۱۲۵۲ھ میں نواب جہانگیر محمدؐ خان سکندر بیگم کے شوہر ہونے کی بناء پر بھوپال کے والیِ ریاست قرار پائے۔ دو تین سال تو میاں بیوی کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار رہے لیکن پھر کشیدہ ہو گئے۔ (ایک روایت کے مطابق نواب جہانگیر محمدؐ خان پردے کے معاملے میں سخت متشدّد تھے جبکہ سکندر بیگم اعتدال پسند تھیں۔ اسی سلسلے میں ایک دن میاں بیوی میں سخت جھگڑا ہو گیا اور نواب جہانگیر محمدؐ خان نے ان پر تلوار اٹھائی۔ یہ بات میاں بیوی میں سخت بگاڑ کا باعث بن گئی) چنانچہ نواب سکندر بیگم اپنی والدہ قدسیہ بیگم کے ساتھ اسلام نگر چلی گئیں۔ وہیں ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ کو نواب سکندر بیگم کے بطن سے نواب شاہجہان بیگم پیدا ہوئیں۔

نواب جہانگیر محمدؐ خان نے ۲۸ ذیلقعدہ ۱۲۶۰ھ ہجری کو بعارضہ ضعفِ معدہ وفات پائی۔ ان کے بعد شاہجہان بیگم رئیسۂ ریاست، نواب سکندر بیگم نگرانِ ریاست اور فوجدار محمدؐ خان مدارالمہام مقرر ہوئے مگر وہ ۱۲۶۳ھ ہجری میں استعفا دینے پر مجبور ہوئے۔ ان کی جگہ منشی جمال الدین خان بہادر مدارالمہام مقرر ہوئے۔ مولانا عبدالحیؒ نے نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے کہ نواب سکندر بیگم نے اسی سال ان سے نکاحِ ثانی کر لیا تھا۔ نواب سکندر بیگم نے یہ دستور کہ نواب بھوپال کے اولادِ نرینہ نہ ہونے کی صورت میں

اس کی بیٹی کا شوہر بھوپال کا حکمران ہوگا، حکومت ہند سے منسوخ کرالیا۔ ۱۲۷۱ھ ہجری میں انہوں نے اپنی لختِ جگر شاہ جہان بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے نواب باقی محمدؐ خان سے کر دی۔ مولانا عبدالقیومؒ فرزند مولانا عبدالحیؒ بوڈھانویؒ نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ دو کروڑ روپے مہر مقرر ہوا۔ اس شادی پر تقریباً آٹھ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ ۱۲۷۳ھ میں سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے شعلے ۱۸۵۷ء بھڑک اٹھے (یہ اہلِ ہند کی جنگِ آزادی تھی لیکن انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا) نواب سکندر بیگم نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ ریاست بھوپال میں کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ چنانچہ انگریزوں اور نواب شاہجہان بیگم کی باہمی رضامندی سے نواب سکندر بیگم بھوپال کی حکمران (رئیسہ) اور نواب شاہجہان بیگم ولی عہد مقرر ہوئیں۔

نواب سکندر بیگم نے اپنے عہدِ حکومت میں دور رس فوجی و انتظامی اصلاحات کیں۔ دفتروں کو مرتّب کیا اور ریاست کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصے پر ایک ناظم مقرر کیا۔ انہوں نے ریاست کا تمام قرض جس کی مقدار تیئس لاکھ اکسٹھ ہزار آٹھ سو اکتالیس روپے تھی، اتار دیا۔ وہ اکثر اپنی ریاست میں دورہ کرتی رہتی تھیں اور لوگوں کی شکایات سن کر ان کو دور کر دیتی تھیں۔ بڑی مخیّر اور دیندار خاتون تھیں۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ جامع مسجد سہور جسے ملک غیاث الدین نے ۷۳۲ھ ہجری میں تعمیر کرایا تھا، کھنڈر کی صورت اختیار کر گئی ہے تو انہوں نے فوراً اس کی تعمیرِ نو کا حکم دیا۔ چنانچہ ۱۲۸۱ھ ہجری میں مسجد کی تعمیرِ نو مکمل ہو گئی اور اس کی اصل شان و شوکت بحال ہو گئی۔

اس سے پہلے ۱۲۸۰ھ ہجری میں نواب سکندر بیگم مع قدسیہ بیگم و فوجدار محمدؐ خان اور ایک ہزار ہمراہیوں کے حجِ بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ

گئیں اور یہ سعادت حاصل کر کے جمادی الاولیٰ ۱۲۸۱ھ ہجری میں واپس بھوپال آئیں۔

۱۲۸۲ھ ہجری میں نواب سکندر بیگم کی بیٹی نواب شاہجہان بیگم کے شوہر نواب باقی محمد خان نے حج سے واپس آکر انتقال کیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیٹی سلطان جہان بیگم چھوڑی۔

نواب سکندر بیگم نے موتی مسجد کے نام سے ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوانی شروع کی لیکن ابھی یہ زیرِ تعمیر تھی کہ اُن کا وقتِ آخر آ پہنچا اور وہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ ہجری کو عالمِ فانی سے دارِ بقا کو سدھار گئیں۔ ان کو فرحت افزا باغ میں دفن کیا گیا جو انہوں نے اپنی زندگی میں خود تیار کرایا تھا۔ ان کی وصیت کے مطابق قبر پر کوئی گنبد وغیرہ نہ بنایا گیا۔

کسی نے ان کی تاریخ وفات یہ کہی:

بیگم عالیہ سکندر نام
چوں بدر البقا نمود سفر
سالِ تاریخ آں ستودہ خصال
گفت شاہجہان غمِ مادر

۱۲۸۵ھ

(تاریخ لودی۔ تاج الاقبال)
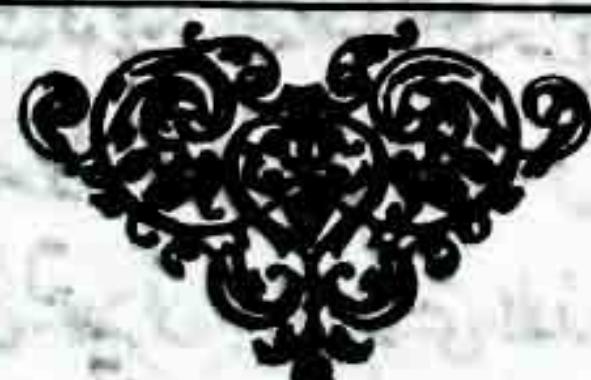
نواب شاہجہان بیگم

نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہان بیگم ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں بھوپال کی حکمران (رئیسہ) بنیں۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ برس کی تھی اور ان کو بیوہ ہوئے تین برس گزر چکے تھے۔ انھوں نے مسند نشین ہوتے ہی غلّہ پر محصول معاف کر دیا اور فوج کی تنخواہ بڑھا دی۔ پھر ساری ریاست کا دَورہ کیا۔ اس کا مقصد رعایا کی داد خواہی، نظم و نسق کی درستی اور حُکّام کے جبر و تعدّی کا انسداد تھا۔ انھوں نے اشاعتِ تعلیم پر خاص توجہ دی اور رفاہِ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں اور نہایت فراخ دلی سے اہلِ علم و ہنر کی سرپرستی کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ایک کاتبہ فاطمۃ الکبریٰ نے ایک پنج سورہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور کاتبہ کو مرصّع پہنچیوں کی ایک جوڑی انعام میں دی۔ اسی طرح دوسرے اہلِ کمال بھی ان کی فیّاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔ انھوں نے اردو اور فارسی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں "تاج الاقبال" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ بھوپال کی تاریخ ہے اور فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے —— اس کے علاوہ "خزینۃ اللغات" اور "تہذیب النسواں" بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں نواب شاہجہان بیگم کا عقدِ ثانی سید صدیق حسن خان قنوجی[1] سے ہوا۔ حکومتِ برطانیہ کی منظوری سے ان کو نواب والا جاہ امیر الملک کا خطاب

---

[1] نواب سید صدیق حسن خان قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے سرآمدِ روزگار (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیا گیا۔ والیانِ ملک کی طرح تمام قلمرو برطانیہ میں ان کے لیے سترہ توپوں کی سلامی بھی منظور ہوئی۔ نواب شاہجہان بیگم نے ان کو پچھتر ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ارباب علم و فضل میں ہوتا ہے۔ ۱۲۴۸ھ میں اپنے ننھیال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اولاد حسن قنوجی تھا جو اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ نواب صاحب کا اصل نام صدیق حسن اور تاریخی نام خورشید حسن تھا۔ ابو الطیب، ابو الطاہر اور ابو الوفا تین کنیتیں تھیں۔ تین ہی تخلص تھے: روحی، نواب اور توفیق۔ سلسلۂ نسب سیدنا حضرت حسینؓ (شہید کربلا) بن علیؓ سے جا ملتا ہے۔ پانچ برس کے تھے کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ والدہ بڑی دیندار اور متقی خاتون تھیں، انہی کی آغوش میں نواب صاحب کی پرورش و تربیت ہوئی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد صرف نحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں نواب صاحب نے اپنے بڑے بھائی مولانا سید احمد حسن عرشی سے پڑھیں۔ پھر فرخ آباد چلے گئے اور مختلف اساتذہ سے مشکوٰۃ المصابیح، درمختار، کافیہ، شرح جامی، قطبی، میر قطبی، افق المبین اور دیگر متداول درسی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے کانپور گئے اور ملا محمد مراد بخاری اور مولانا محمد محب اللہ پانی پتی سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۶۹ھ میں دلی پہنچے اور صدر الافاضل مفتی صدر الدین آزردہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تقریباً دو برس تک کتب منقول و معقول پڑھ کر علوم رسمیہ سے فارغ ہو گئے۔ دلی کے اثنائے قیام میں کئی دوسرے اکابر علماء سے بھی استفاضہ کیا اور ان سے اجازۂ حدیث لیا۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اور ان کے ولی عہد مرزا فخرو سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ دلی میں ان کا قیام نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے مکان پر رہا اور ان سے مخلصانہ تعلق قائم ہو گیا۔ تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر وہ اکیس برس کی عمر میں واپس قنوج پہنچے مگر وہاں گزر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ تلاشِ معاش میں بھوپال پہنچے۔ یہ نواب سکندر بیگم کا زمانہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عطا کی اور سرکاری مراسلوں میں ان کے لیے مندرجہ ذیل القاب و آداب مقرر کیے گئے :

" نواب صاحب معدنِ محامد اخلاق، مخزنِ مکارمِ اختصاص، نواب والاجاہ امیرالملک سید محمد صدیق حسن خاں صاحب بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ "۔

نواب شاہجہان بیگم کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ اردو میں شیریں تخلص تھا اور فارسی میں " شاہجہاں "۔ بالعموم فارسی میں مشقِ سخن کرتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تھا۔ انہوں نے مدارالمہام منشی محمد جمال الدین خاں کی سفارش پر انہیں تیس روپیہ ماہوار پر منشی مقرر کر دیا۔ کچھ مدت بعد میر دبیر کے عہدے پر تقرر ہو گیا لیکن ایک سال بعد بوجوہ ملازمت سے الگ ہونا پڑا (اس کا بڑا سبب حقّہ کی اباحت اور کراہت کے بارے میں ان کا مولانا علی عباس چڑیا کوٹی سے اختلاف تھا)۔ وطن واپس ہوتے ہوئے کچھ عرصہ کانپور اور بلگرام میں قیام کیا۔ قیامِ بلگرام کے دوران میں چند مہینوں کے اندر قرآنِ پاک حفظ کر لیا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔ نواب صاحب کے لیے یہ بڑی عسرت کا دور تھا۔ کئی کئی مہینے تک کالے رنگ کے موٹے جھوٹے کپڑے کا ایک ہی جوڑا پہنے رہتے۔ اسے خود ہی دھو کر پھر پہن لیتے۔ روکھی سوکھی روٹی پانی کے سہارے حلق سے اتار لیتے۔ بلگرام سے قنوج پہنچے تو وہاں نمک کی کنکری کا سہارا بھی نہ تھا مجبوراً تلاشِ معاش کے لیے پھر وطن سے نکلے یزداپور ہوتے ہوئے ٹونک پہنچے۔ نواب وزیرالدولہ بڑے احترام سے پیش آئے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ابھی وہاں آٹھ مہینے ہی گزرے تھے کہ والیۂ بھوپال کی طرف سے طلبی ہوئی۔ اب کے بھوپال پہنچے تو وہاں فضا سازگار تھی۔ بیگم صفر ۱۲۷۶ھ کو ریاست کی تاریخ لکھنے پر ان کا تقرر ہو گیا۔ پچھتر روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ منشی جمال الدین خاں مدارالمہام ان کے علم و فضل، خاندانی نجابت و شرافت، دینداری

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نمونۂ کلام یہ ہے:

تا چراغِ عقل در فانوسِ دل افروختیم
عُجب و نخوت جملہ اسبابِ جہالت سوختیم

گو بہر گناہ وقف فرصت باشم
در طاعتِ حق کمینہ ہمت باشم
نا امیدنیم کہ نا امیدی کفر است
ہر لحظہ امیدوارِ رحمت باشم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اور محاسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی بیوہ لڑکی زکیہ بیگم کا نکاح ثانی ان سے کر دیا۔ ۱۲۸۵ھ میں نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہان بیگم والیۂ ریاست بنیں۔ اسی زمانے میں نواب صاحب کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ مکۂ معظمہ میں انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور اخلاق و تصوف کی نادر کتابوں کے دو دو نسخے خریدے اور بعض رسالوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا۔ حرمین شریفین سے واپس بھوپال آئے تو نواب شاہجہان بیگم نے پہلے تو انہیں سررشتۂ تعلیمات کے مدارس کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا اور پھر ۱۲۸۷ھ ~~۱۸۷۰ء~~ میں ان سے عقدِ ثانی کر لیا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے باہمی تعلقات ہمیشہ بڑے خوشگوار رہے لیکن حاسدوں نے نواب صاحب کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور انگریزوں تک یہ بات پہنچائی کہ نواب صاحب حکومتِ برطانیہ کے دشمنوں (وہابیوں) سے ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا۔ ان سے خطاب واپس لے لیا گیا۔ توپوں کی سلامی موقوف کر دی گئی اور حکم دیا گیا کہ وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ نواب صاحب نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور اپنے آپ کو ہمہ تن دین اور علم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ نواب شاہجہان بیگم کی کوششوں سے حکومتِ ہند کی نواب صاحب کے خلاف بدگمانی دور ہو گئی لیکن اسی اثناء میں نواب صاحب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شور بخت من و گفتار رقیب و خنش
بر سرِ زخم شکستیم نمک دانے چند

مشکل مرض است ایں کہ بہ فریاد رسیدہ است
آں کس کہ بہ فریاد رسیدن نتواند!

(باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کو مرضِ استسقاء لاحق ہوگیا اور وہ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ نواب صاحب نے اپنے پیچھے ایک لڑکی اور دو لڑکے چھوڑے جو ان کی پہلی بیوی زکیہ بیگم کے بطن سے تھے۔ نواب شاہجہان بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نواب صاحب کا عظیم بالشان کارنامہ ان کی علمی اور دینی خدمات ہیں۔ ان کے عہد میں بھوپال اسلامی علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا جہاں اقصائے ہند کے علاوہ دُور دُور کے ملکوں سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بُجھانے آتے تھے۔ نواب صاحب نے عربی کی امہات کتب جمع کرنے کا خاص اہتمام فرمایا اور ایک لاکھ روپیہ (جو آج کل کے دو کروڑ سے بھی زیادہ کے برابر ہیں) خرچ کر کے تفسیر و حدیث کی نایاب کتابیں شائع کیں اور اقصائے عالم کے کتب خانوں اور علماء کو مفت مہیا کیں۔ ان میں تفسیر ابنِ کثیر، فتح الباری شرح صحیح البخاری اور امام شوکانیؒ کی نیل الاوطار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے تمام انواعِ علوم اور اصنافِ فنون (صرف، نحو، لغت، تفسیر، حدیث، فقہ، بدیع، ادب، تاریخ و سِیَر، تصوّف، شعر و انشاء، تذکرہ، مناقب، علم الاشتقاق وغیرہ) پر عربی فارسی اور اردو میں دو سو بائیس کتابیں خود تصنیف کیں ان میں سے بیشتر کتابیں شائع ہوگئیں البتہ کچھ غیر مطبوعہ قلمی کتابیں بھی تھیں جن کا سراغ نہیں ملتا۔ نواب صاحب کی چند مشہور تالیفات کے نام یہ ہیں :

اے چرخ چہ کردی بہ سلیمان وسکندر — کز تو ہوس عیش بود شاہ جہاں را

چو زعہد او بہ پرسم چہ بلا جواب گوید — کہ ہزار جا بہ بستم بہزار جا شکستم
پئے قدر ناشناسے کہ بہ رائگاں نہ گیرد — دل بے بہائے خود را بعبث بہا شکستم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

فتح البیان فی مقاصد القرآن (سات جلدیں)، اکسیر فی اصول التفسیر، عون الباری لحل ادلۃ البخاری، ترجمان القرآن (پندرہ جلدیں) فتح العلام بشرح بلوغ المرام، السراج الوھاج فی شرح مختصر الصحیح المسلم بن حجاج، اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین، التاج المکلل، ابجد العلوم، العلم الخفاق من علم الاشتقاق، شمع انجمن —— علاوہ ازیں صحاح ستہ کے اولیں تراجم و شروح کے اہتمام کی سعادت بھی نواب صاحب کے حصے میں آئی۔ انہوں نے مولانا وحید الزماں اور مولانا بدیع الزماں کے معقول وظائف مقرر کرکے دونوں بھائیوں کو صحاح ستہ کے اردو تراجم پر لگا دیا۔ نواب صاحب نے مدارس و مکاتب کی اس طرح سرپرستی کی کہ نظام الملک طوسی کی یاد تازہ ہوگئی۔ ذاتی زندگی میں بھی نواب صاحب نہایت متقی، خاشع، عبادت گزار اور پابندِ سنت تھے۔ فی الحقیقت وہ جملہ محاسنِ اخلاق کا پیکرِ جمیل تھے۔ غربا، مساکین اور طلبہ کے لیے وہ ایسا ابرِ سخاوت تھے جو اُن پر جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔ وہ نہایت وجیہ وجمیل، گورے چٹے، متناسب الاعضا اور متشرع شکل وصورت کے آدمی تھے۔ نواب صاحب عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

نو فغاں ہیں اور نو فریاد ہم —— رحم کے قابل ہیں اے صیاد ہم

ہوا جو وصل میسر تو یہ ہوئی حسرت —— کوئی دن اور ابھی مشقِ آرزو کرتے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)